اور اخلاص کے علاوہ غور و فکر کا عنصر شامل ہوتا ہے، یہ کتاب بھی اسی جذبہ سے لکھی گئی اور بڑی مفید اور کارآمد باتوں پر مشتمل ہے۔

شب جائے کہ من بودم ۔ مرتبہ جناب شورش کاشمیری تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۱۲ مجلد مع گردپوش، قیمت ۔ پتہ: مطبوعات چٹان میکلوڈ روڈ، لاہور،

پاکستان سے مراسلت کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے وہاں کے ممتاز مصنف، مشہور شاعر، نامور صحافی اور دار المصنفین کے بڑے قدر داں جناب شورش کاشمیری نے اپنی کتابوں کا سٹ ا۔ فتہ دار چٹان ارسال کیا، معارف میں تبصرہ کے لیے پہلے انکی کتابوں میں سے اس کتاب کا انتخاب کیا جا رہا ہے جسمیں انکے مقدس سفر حج کی روداد ہے۔ شورش صاحب نے ۱۹۶۹ء میں ہوائی جہاز سے حج کا سفر کیا، چودہ دنوں تک انکو بیت اللہ، بارگاہ رسالت اور ارض قرآن میں باریابی کی سعادت میسر آئی، ان کا دل خدا کی عظمت، اسلام کی محبت، رسول کی عقیدت اور قوم و ملت کے درد سے سرشار اور طبیعت بڑی حساس اور بیچین ہے، اسلیے حرمین اور مقدس مقامات میں حاضری کے وقت ان پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی جسکی پوری تصویر اس کتاب میں ملتی ہے، ہر مقام پر انکو قرن اول کے واقعات یاد آئے ہیں جنکو پر اثر انداز میں لکھکر عربوں اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کا بھی جائزہ لیا ہے، انکو مکہ میں کھجور اور زمزم اور جدہ میں زبان و اذان کے علاوہ ہر طرف یورپ کا مال نظر آیا، وہ یہودیوں کے قبلہ اول کے لے اڑنے اور نصاریٰ کے ہمت و ہمی کا لہو نچوڑ نے اور عربوں کے طیش کے ختم ہو جانے اور عیش میں مبتلا ہو جانے کا ذکر کر کے بھی اشکبار ہوئے ہیں، آل سعود کے قبروں اور مقدس مقامات کے بارہ میں رویہ کا تذکرہ سخت لہجہ میں ذکر ہے، گو یہ شکوہ شورش صاحب کی فرط عقیدت کا بھی نتیجہ معلوم ہوتا ہے، بعض اوقات شرح کیے معاملات عقیدت و محبت کے جذبات کی تہہ کے نیچے دبکر رہجاتے ہیں، ص ۶۵ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غار حرا میں مسلسل ۴۰ سال تک تشریف لیجانے اور عبادت کرنے کا ذکر ہے، حالانکہ آپ نے ۴۰ سال کی عمر میں وہاں جا کر عبادت کرنا شروع کیا تھا، یہ کتاب شورش صاحب کے مخصوص انشا پردازانہ انداز بیان کا نمونہ ہے، اسکے مطالعہ سے ناظر کا غذ کی کثافت ناظرین بھی اپنے کو کیفیات اور جذبات سے محفوظ اور سرشار پائیں گے، کتاب کے نام میں بھی ترمیم دل آویز ہے، کی ہو داد طلب شروع میں مقدس مقامات کی تصویریں بھی دی گئی ہیں،

جلد ۱۱۵ ماہ اپریل ۱۹۷۵ء مطابق ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۹۵ھ عدد ۴

مضامین

شذرات

۲۵ مارچ ۱۹۷۵ء کو سعودی عرب کے شاہ فیصل شہید کر دیئے گئے، اس حادثۂ جانکاہ سے اسلامی ممالک میں اندوہ و غم کا ایک بادل امنڈ پڑا کہ آہ! اسلام کا پاسبان، اسلامی حمیت و غیرت کا نگہبان، اسلامی مواخات و یگانگت کا حدی خوان نہیں رہا، اسلامی زندگی کی قوتِ پنہاں کو آشکار، مسلمانوں کے سینوں میں عزائم کو بیدار، اور اُن کی نگاہوں کو تلوار کرنے والا جاتا رہا،

مدتوں کے بعد بڑی مشکل سے اسلامی دنیا میں ایک دیدہ ور پیدا ہوا، جس کے مقاصد جلیل تھے، جس کی ادائیں دلفریب، دلنواز تھیں، اسلام کے اس بطلِ حریت نے صرف گیارہ سال حکومت کی، مگر اپنے کارنامے اسلامی تاریخ کے زریں باب بن کر رہیں گے، سعودی عرب کو دنیا کے متمول ترین ملکوں کی صف میں لاکھڑا کیا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو صحیح معنی میں فردوسِ نگاہ بنا دیا، پٹرول کو جنگی اسلحہ سے زیادہ مہلک تسلیم کرا کے دنیا کی اہم طاقتوں کو بھی اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کیا، حاتم طائی کی افسانوی سخاوت کی شہرت کو ماند کر کے عرب کو اپنی مالی امداد سے سرفراز اور سرخرو کیا، پچھڑے ہوئے مسلمان ملکوں کی دست گیری کر کے اُن کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دلایا، اسلامی بینک، اسلامی سکریٹریٹ، اسلامی خبر ایجنسی، اور اسلامی سربراہ کانفرنس کی روح رواں بن کر یہ خاموش پیام دیا کہ توحید کی امانت سینے میں رکھنے والے اخوت کا جہان، اور محبت کی زبان بن کر دہر کو اسمِ محمد سے اجالا کر دیں، اور جب کتابِ ملتِ بیضا کی شیرازہ بندی پھر سے ہو رہی تھی تو آیاتِ الٰہی کے اس نگہبان کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی مصلحت سے اپنے پاس بلا لیا، جہاں خود روحِ محمدی سے کہہ رہا ہوگا، ع:۔ اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے،

خبر ملی ہے کہ مسلم یونیورسٹی اس سال اپنے کانووکیشن میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کو ڈی لٹ کی ڈگری دیکر اس ڈگری کا اعزاز بڑھانا چاہتی ہے، یہ دونوں عظیم شخصیتیں ہر قسم کے اعزاز سے بالاتر ہو چکی ہیں، کوئی طرۂ امتیاز ان کی جانی پہچانی عظمت میں اضافہ تو نہ کر سکے گا، لیکن ایک یونیورسٹی کی طرف سے اُن کی قدردانی علم و ادب کے حلقہ میں ایک مژدہ ضرور ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی تقریباً بہتر سال سے اپنے قلم کا جوہر دکھا رہے ہیں، اس قلم کی مختصر سرگذشت یہ ہے کہ بچپن ہی میں یہ جوان ہو گیا، جوانی میں بوڑھوں کا مدِ مقابل بن گیا، اور بڑھاپے میں علم و فن کا فرمانروا تسلیم کرا لیا گیا، مولانا شہر کے ہنگاموں سے دور ایک قصبہ میں اپنے فن کا تختِ طاؤس بچھایا، اسی پر جلوہ افروز ہو کر اپنے قلم کو رضع کار، مینا نگار بنایا، خود قلم ان کو کورنش بجا لا کر زمین بوس ہوتا رہا، اُن کی صاحبقرانی علم و ادب کے بیشمار معرکوں اور قزاقوں کی صفوں میں نمایاں طور پر دکھائی دیگی، جہاں للکار بھی ہے، یلغار بھی، تیر و خدنگ کا وار بھی، رجز بھی، چپقلش بھی، فرزانگی بھی اور جنون بھی، انھوں نے فلسفی، ماہر نفسیات، مترجم، مقالہ نگار، نقاد، غم گسار، صحافی، حق گو، دوست نواز، شاعر، مدیر، معلم اخلاق اور مفسر قرآن بن کر اپنی تحریروں میں بڑی رنگا رنگی پیدا کی، جو کبھی تندیِ صبا بن کر گنجینۂ دل کو کھلاتی، کبھی موجِ خرامِ یار بن کر گل کترتی، کبھی قلب کو گرماتی اور کبھی روح کو تڑپاتی رہی، اور جب ان پر خاتمہ بالخیر کا جذبہ طاری ہوا تو تفسیر کلام پاک لکھنے بیٹھے، اور اس کو گنجینۂ تحقیق و معارف بنا دیا، جو اُن کے لئے توشۂ آخرت بھی ہے،

اُن کی تحریروں کے ایجاز کی سحر طرازی، بلاغت کی سحر کاری، فصاحت کی تازگی اور سلاست کی دلکشی اردو ادب کے شہ پارے ہیں، اُن کے ترجموں میں جو برجستگی ہے، تنقید نگاری میں جو فن کاری ہے اور طنز و مزاح میں جو طراری ہے، اس کے اوصاف کی شرکت غیرے ممکن نہیں، انھوں نے اپنے معترضوں اور خصوصاً مذہب اور روحانی قدروں کے مخالفوں کے لئے کبھی زبان سے چھلنی کیا تو عقیدت و محبت کے اظہار میں بے پایاں دلسوزی اور دلنوازی کے جلوے بھی دکھائے، اظہار حق میں اُن کی جرأت بے باکی بلکہ تیر باری کی بڑی شہرت ہوئی، انھوں نے اپنے چند چبھتے پھڑکتے جملوں اور خصوصاً [illegible] جو کام لیا، بڑے بڑے مقالہ نگار اور کالم نویس اپنی لمبی تحریروں سے نہیں لے سکے، اُن کی تفسیر و حدیث دانی اور [illegible] سے برابر جھلملاتی رہیگی، وہ اپنی آخری عمر میں یہ خوش ہو گئے کہ علم و ادب و فن کا ایک گلزار لگا کر چلے، مسلم یونیورسٹی اُن کی قدردانی نہ کرتی تو کس کی کرتی،

پروفیسر رشید احمد صدیقی معلوم نہیں کتنے اہل علم کے گلے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں کے ہار ڈال چکے ہیں، اب مسلم یونیورسٹی اپنی اعلیٰ ترین ڈگری کا ہار ان کو پہنا کر اپنی زینت بڑھائیگی، علی گڑھ یونیورسٹی اُن کو سنوار رہی ہے تو انھوں نے بھی اس کو سنوارا، جو ان کا قلم اس کے ذکر میں وجد آفریں رقص کرتا ہوا لکھتا رہا، ع:۔ ہم ایسے میں بار بار پوچھا گیا،

دو دیہاں کے منصور ہیں، اُن کے سر بن ہوے انا العلی گڈھ کی صدا بلند ہوتی رہی ہے، اسی کے نظارۂ جمال بلکہ سواد خط و خال سے اپنی رعنائی خیال کی جنت بنا رکھی ہے،

وہ اس جنت میں زبان و ادب کے رضوان بن کر آئے، تو پہلے یہاں بقول انہی کے اعلیٰ کو پانے اور ادنیٰ سے بچنے کا حوصلہ پایا، پھر سرسید کی روح کو جگا کر اپنے طلبہ کے لئے خضر راہ بنے، اُن کی نظر میں وسعت، فکر میں جہاد اور قلب میں سوز و ساز پیدا کرنے کی کوشش کی اور جب مے کے پیمانہ و صہبا سے سرشار ہو کر اپنے قلم کی گل افشانی کی ابتدا کی تو طنزیات و مضحکات کو طرز ادا کی شائستگی اور زندگی کی توانائی عطا کی، جس سے ذہن کو صفائی اور تخیل کو تجلی ملی، اپنے پیشرو اور معاصر مزاح نویسوں اور طنز نگاروں سے الگ ہو کر انھوں نے اس صنف کو جتنی اونچی سطح پر لیجا کر چھوڑا ہے، اس سے آگے شاید تو کوئی اور نہ لے جا سکے گا، بچوں کیلئے کچھ لکھا تو اُن کی ساری تحریریں الفت کی پھوہار اور محبت کا ابشار بن گئیں، دوستوں کی دائمی مفارقت پر آنسو بہانے بیٹھے تو اپنے ساتھ اپنے ناظرین کو بھی طوفان غم سے زیر و زبر کیا،

تنقید و ادب کی انجمن میں شریک ہوئے تو خود ایک انجمن بن گئے، اُن کی تحریریں دامان باغباں اور کف گل فروش بنتی چلی گئیں، ماضی سے بیزار اور حال سے مایوس ہونے کے بجائے دونوں کی عظمت کا رس نچوڑا، اور آنے والی نسلوں کو اس رس کے نچوڑنے کا درس دیا، اُن کا خیال ہے کہ جدید اردو میں ان تمام صالح دل کشی و قیمتی عناصر کی جلوہ گری ملتی ہے، جن سے خود علی گڑھ عبارت ہے، مگر اس دل کشی، اور جلوہ گری کے کارواں کے یوسف وہ خود بنے رہے، ان کی تحریروں میں روشن ضمیری، خیر اندیشی، شرافت نفس، طہارت فکر اور ندرت بیان کے حسن کی جو چھٹکی ہوئی چاندنی ہے، وہ جدید اردو کی ایک باعظمت روایت بن گئی ہے، علی گڈھ سے اعزازی ڈگری پانے میں اُن سے زیادہ کون حق دار ہو سکتا تھا، یونیورسٹی اون کی شام زندگی میں یہ ڈگری دے کر اپنا حق اور فرض تو ضرور ادا کر دے گی، مگر اس کے دینے میں جو تاخیر ہوئی، اس کا الزام اس پر باقی رہے گا،

مقالات

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۳)

ہندوستان کے معاشرتی حالات کے مطالعہ میں مہر و محبت کی فضا

البیرونی کی کتاب میں ہندوؤں کے معاشرتی حالات کا بھی بہت ہی خوشگوار تجزیہ ہے، جس میں مہر و محبت اور افہام و تفہیم کی بڑی اچھی فضا ہے، ان ہی باتوں سے متاثر ہو کر پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی نے لکھا ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقیدہ کی وجہ سے ایسے لوگوں کو نظر انداز کرنا پسند نہیں کرتا تھا جو دوسرے ماحول اور فضا میں پھلے اور پھولے، اسکی یہ رواداری، بے تعصبی بلکہ بے لاگ پن ایسا وصف ہے جس کے لیے ہندوؤں کو اس کا ممنون ہونا چاہئے اور علمی دنیا بھی اسکی شکر گذار ہے، اسکی یہ خوبی لیاقت و صلاحیت سے زیادہ قیمتی ہے، (البیرونی یادگار جلد ایران سوسائٹی، کلکتہ، ص ۴۳) البیرونی نے ہندو مسلمانوں کی بیگانگی دور کرنے کی کوشش میں عربی جاننے والوں کیلئے سنسکرت سے اور سنسکرت جاننے والوں کیلئے عربی سے کتابیں بھی ترجمہ کیں، جنکی ایک لمبی فہرست ہے، ان ہی میں پاتنجلی اور وراہ مہر کی کتاب لکھو جاتکم کے بھی ترجمے کیے، قانون مسعودی میں ہندوستان کے قیمتی پتھروں اور اس کے شہروں کے طول بلد اور عرض بلد کا بڑا فاضلانہ مطالعہ ہے، اس سے اس کے ملک کی محبت کا اظہار ہوتا ہے،

البیرونی نے ہندوؤں کی معاشرتی زندگی کی بھی بڑی حقیقت پسندانہ تصویر کھینچی ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ آج سے تقریباً ایک ہزار برس پہلے ہندوستان کی جو معاشرت تھی اس میں سے ابتک کیا چیزیں

اسی طرح سے باقی ہیں اور کن کن چیزوں میں تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں،

البیرونی پہلے تو ہندوؤں پر عام تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ غیروں کو ملیچھ یعنی ناپاک سمجھتے ہیں، ناپاک سمجھنے کی وجہ سے ان سے ملنا جلنا، شادی بیاہ کرنا، ان کے قریب جانا یا ساتھ بیٹھنا اور ساتھ کھانا جائز نہیں سمجھتے، البیرونی نے اس کے مضرت رساں پہلوؤں کی طرف یہ لکھ کر اشارہ کیا ہے کہ اس طرح ہندوؤں میں کسی شخص کو جو ان کی قوم سے نہیں ہے اور ان میں داخل ہونے کی رغبت اور ان کے دین کی طرف میلان رکھتا ہے، اپنے اندر داخل کرنے کی مطلق اجازت نہیں، (عربی ص ۱۰ اردو ترجمہ جلد اول ص ۱۷)

معاشرتی زندگی کے کچھ پہلو

البیرونی نے ہندوؤں کی معاشرتی زندگی کی تفصیلات بیان کرنے میں یہ عجیب بات لکھ دی ہے کہ یہ لوگ بال نہیں منڈاتے، ان کی اصلی حالت گرمی کی شدت سے ننگے رہنے کی ہے، بال اس لیے نہیں منڈاتے کہ کھلا رہنے سے سر پر گرمی نہ چڑھ جائے، داڑھی کی حفاظت کے لیے اس کی چوٹیاں گوندھ لیتے ہیں" بال نہ منڈانے یا داڑھی کی چوٹیاں گوندھنے کا رواج عام رہا ہوگا، ممکن ہے کہ یہ دونوں باتیں کسی مذہبی گروہ میں پائی جاتی ہوں، پھر معلوم نہیں کس گروہ کے متعلق اس نے یہ لکھا ہے کہ ننگے رہنے پر فخر کرنے کے لیے ناخن بڑھاتے رہتے ہیں، اس لیے کہ ناخن کے ساتھ محنت طلب کام نہیں ہوسکتا، اور اس لیے بھی کہ اس سے سر کھجانے اور جوں مارنے میں آرام ملتا ہے، (عربی ص ۸۹ اور اردو ترجمہ جلد ا ص ۲۴۰) آج یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ کون سا گروہ ننگا رہنا پسند کرتا تھا، جس کے لیے وہ ناخن بڑھالیا کرتے تھے،

ہندوؤں کے کھانے پینے کے آداب

ہندوؤں کے کھانے پینے کے آداب کے متعلق بھی معلومات ہیں، لکھتا ہے کہ "ہندو گوبر کے دسترخوان پر اکیلے بیٹھ کر کھاتے ہیں" گوبر کے دسترخوان

سے مراد شاید چوکے کے گوبر سے لیپائی ہو، جو اب تک کہیں کہیں ہوتی رہتی ہے، اس کے بعد وہ تحریر کرتا ہے کہ جو کھانا بچ جاتا ہے اس کو دوسری دفعہ استعمال نہیں کرتے اور جس برتن میں کھاتے ہیں، اگر وہ مٹی کا ہو تو اس کو پھینک دیتے ہیں، (عربی ص ۸۹ اردو ترجمہ جلد ا ص ۲۴۰) یہ عادت تو اب تک جاری ہے، پان کھانے کی عادت بھی ہندوستان میں بڑی پرانی ہے، اسلیے لکھتا ہے کہ پان چونہ کے ساتھ کھا کر اور سپاری چبا کر دانتوں کو سرخ کرتے ہیں، (عربی ص ۸۹ اردو ترجمہ جلد ا ص ۲۴۰) اس کے بعد البیرونی لکھتا ہے، نہار منہ شراب پیتے ہیں، اس کے بعد کھانا کھاتے ہیں، گائے کا پیشاب تھوڑا تھوڑا پیتے ہیں، اس کا گوشت نہیں کھاتے، (عربی ص ۸۹ اردو ترجمہ جلد ا ص ۲۴۱) گائے کا پیشاب پینے کا تو شاید عام رواج نہ رہا ہو بعض مذہبی مراسم کے موقع پر شاید پیا جاتا ہو، جگر کے مریض بھی اس کو دوا کے طور پر اکثر استعمال کرتے ہیں،

ہندوؤں کا لباس

لباس کے متعلق لکھتا ہے "عمامہ کو سروال یعنی دھوتی بناتے ہیں، جو شخص لباس میں اختصار کرتا ہے وہ دو انگل کی دھجی پر قناعت کرتا ہے، جس کو وہ دو دھاگے سے ستر پر باندھ لیتا ہے، (عربی ص ۸۹ اردو ترجمہ جلد ا ص ۲۴۰) اس آخری ٹکڑے سے لنگوٹی کی طرف اشارہ ہے جو کہیں کہیں اب تک استعمال ہوتی ہے، اس کے بعد جس لباس کی تفصیل ہے اس کی نوعیت سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ ایسا لباس اب کسی طبقہ میں نہیں دکھائی دیتا، یا شاید اس زمانہ میں سرد پہاڑی علاقوں میں پہنا جاتا ہو، روئی کے دگلے تو ابھی تک پہنے جاتے ہیں، البیرونی لکھتا ہے" جو زیادتی کرتا ہے وہ ایسے سراویل (لہنگا) پہنتا ہے جس میں اتنی روئی بھری رہتی ہے جو کئی لحاف کے لیے کافی ہو، پھر وہ ایسا جھول پہنتا جس کے چاک ایسے بند ہوتے ہیں کہ ان سے دونوں پاؤں باہر نہیں نکلتے اور ان کی گھنڈی پیچھے کی طرف ہوتی ہے، اس کے بعد جن ملبوسات کا ذکر ہے وہ واضح ہیں، صدری (سینہ

کا لباس) سراویل (پائجامہ) سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں، ان کی بندش گھنڈیوں کے ساتھ پیٹھ کی طرف ہوتی ہے، کرتے کے دامنوں میں دائیں اور بائیں چاک رکھتے ہیں، جوتہ اس قدر تنگ ہوتا ہے کہ اس کو پنڈلیوں کی طرف سے قدم کی طرف موڑ کر پہنا جاتا ہے (عربی ص ۸۹ اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۳۹-۲۴۰)، اس کے بعد ہے کہ مرد عورتوں جیسا لباس پہنتے ہیں، رنگوں کا استعمال کرتے ہیں، کان میں آویزے، ہاتھوں میں کنگن، کنگلیوں اور پانوں کی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں پہنتے ہیں (عربی ص ۸۹ اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۴۰-۲۴۱) عورتوں جیسا لباس سے مراد غالباً رنگین دھوتیاں ہوں، مردوں کا آویزے اور کنگن پہننا تو بعض جگہوں پر غالباً انیسویں صدی تک بھی جاری رہا، اور اب بھی کہیں کہیں پہنے جاتے ہیں، ہاتھوں کی انگلیوں میں انگوٹھیاں تو اب بھی پہنی جاتی ہیں، البتہ پانوں کی انگلیوں میں اب مرد انگوٹھیاں نہیں پہنتے۔

ہندو عورتوں کی اہمیت

البیرونی کے اس بیان سے کہ "مرد عورتوں سے انتظام اور جو امر پیش آجاتے اس میں مشورہ لیتے ہیں (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۴۲) ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی معاشرہ میں عورتوں کی کافی اہمیت تھی، البتہ البیرونی کی یہ بات محل نظر ہے کہ وہ بیٹوں میں چھوٹے کو ترجیح دیتے ہیں خصوصاً پورب کے علاقہ میں، یہ سمجھ کر کہ بڑا لڑکا باپ کی شہوت غالبہ سے پیدا ہوتا ہے، اور چھوٹے کا وجود ارادے، فکر اور سکون سے حاصل ہوتا ہے (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۴۲) کیونکہ ہندوستان کی معاشرت میں شروع سے اب تک بڑے لڑکے ہی کی اہمیت زیادہ رہی ہے اور حکمران خاندانوں میں وہی اصلی وارث سمجھا جاتا ہے۔

معاشرتی جزئیات کا معاملہ

البیرونی کا مشاہدہ بڑا گہرا تھا، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی نظر

رکھتا، چنانچہ لکھتا ہے کہ ہندو مصافحہ میں ہاتھ کو پشت دست کی طرف سے پکڑتے ہیں، گھر کے اندر آنے کے لیے اجازت نہیں طلب کرتے، مگر باہر اجازت کے بغیر نہیں جاتے، مجلسوں میں چار زانو بیٹھتے ہیں، بڑوں کے ادب کے بغیر تھوک پھینکتے رہتے ہیں، ان کے سامنے جوں مارتے رہتے ہیں، .... چھینک کو منحوس سمجھتے ہیں، جولاہے کو ناپاک سمجھتے ہیں لیکن حجام کو اور اس شخص کو جو مرتے ہوئے جانوروں کو اجرت لے کر ڈبا کے یا جلا کے مار ڈالتا ہو پاک سمجھتے ہیں (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۴۲) اس اقتباس میں جولاہے کو ناپاک سمجھنے کی روایت تو کچھ مشکوک معلوم ہوتی ہے،

ابتدائی نوشت وخواند کے طریقے

لڑکے اس زمانہ میں تختی پر جس طرح لکھتے اس کا رواج اب تک جاری ہے، البیرونی دلچسپ طریقہ پر لکھتا ہے کہ لڑکوں کے لیے مکتب کی تختیوں کو سیاہ رنگواتے ہیں، اس کے عرض میں نہیں بلکہ طول میں سفیدی سے بائیں طرف سے دائیں طرف لکھواتے ہیں، گویا ذیل کا شعر شاعر نے ان ہی کی شان میں کہا ہے،

"کوئی لکھنے والا ایسا بھی ہے جس کا کاغذ کوئلہ کی طرح سیاہ ہے، اس میں اس کا قلم سفیدی سے لکھتا ہے، گویا وہ رات میں روز روشن کو لکھتا ہے، وہ اس کو تانتا ہو بنتا نہیں ہے (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۴۳)

البیرونی کا یہ بیان بھی موجودہ ذوق سے کچھ مختلف ہے۔

کتاب کا نام آخر میں خاتمے پر لکھتے ہیں، ابتدائے کتاب میں شروع میں نہیں لکھتے، اپنی زبان کے اسماء کو مؤنث بنا کر اس میں عظمت پیدا کرتے ہیں، جس طرح اہل عرب تصغیر بنا کر عظمت پیدا کرتے ہیں (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۴۳)

ہندوؤں کے کھیل

وہ کھیلوں میں چوسر اور شطرنج کا ذکر کرتا ہے، چوسر کے متعلق لکھتا ہے کہ

دو آدمی کھیلتے ہیں، لیکن پانسہ دونوں کے درمیان تیسرا شخص پھینکتا ہے، اس زمانہ میں اس نے شطرنج کھیلنے کا جو طریقہ بتایا ہے وہ آج سے بالکل ہی مختلف ہے، اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہو کہ شطرنج چار آدمی مل کر دو پانسے کے ذریعہ کھیلتے تھے، جو بساط کے گرد مربع شکل میں بیٹھ جاتے تھے، اور باری باری اپنے درمیان دونوں پانسے پھینکا کرتے ہیں، پانسے کے عدد سے مہرہ چلایا جاتا تھا ہر مہرہ کے لیے علیحدہ علیحدہ عدد مقرر تھے۔ (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ ج ۱ ص ۴۴ ۔ ۲۴۳)

ہندوؤں کا نفسیاتی مطالعہ

البیرونی ہندوؤں کا نفسیاتی مطالعہ کرکے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ان کی فطرت میں طبیعت کی مخالفت داخل ہے، اور اس کی دلیل یہ دیتا ہے کہ ہم نے کسی ہندو لڑکے کو جو اسلامی ملکوں میں نیا آیا ہو اور اس ملک والوں کے طریقہ کا مشتاق نہ ہو، ایسا نہیں پایا جو اپنے آقا کے سامنے ہمیشہ کھڑاؤں اس کے اصلی وضع کے خلاف یعنی داہنے پاؤں والی کو بائیں کے لیے نہ رکھتا ہو، کپڑا الٹا نہ کرتا ہو، فرش الٹا نہ بچھاتا ہو، اور اسی قسم کی بہترین باتیں ہیں، اس کا سبب یہی ہے کہ اس کی فطرت میں طبیعت کی مخالفت ہو (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ جلد ۱ ص ۲۴۶) یہ ضروری نہیں کہ البیرونی کے اس نتیجہ کو صحیح سمجھا جائے۔

ہندوؤں کے کیمیا بنانے اور جھاڑ پھونک کا طریقہ

البیرونی نے اپنی کتاب کے ۱۷ویں باب میں اس زمانہ کے ہندوؤں کے کیمیا بنانے، رسائن کے فن اور جھاڑ پھونک سے متعلق معلومات فراہم کیے ہیں، گو اس نے ان علوم کو اہمیت نہیں دی ہے اور ان کی بنیاد جہالت پر قرار دی ہے، پھر بھی اس سلسلہ میں بہت سے دلچسپ واقعات قلم بند کیے ہیں، کیمیا کو وہ جادو تو نہیں بلکہ خبط کہتا ہے، لکھتا ہے کہ اس فن کے جاننے والے اس کو چھپانے کا بڑا اہتمام رکھتے ہیں، اس کو ایک بے بنیاد علم سمجھنے کے باوجود اس نے اس مشہور افسانہ کا بھی ذکر کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کیمیا کے اثر سے ایک چرواہے کا ایک کتا اور ایک سادھو سونا بن گیا۔

رسائن کے متعلق اس کا بیان ہے کہ یہ جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے جس کو کھا کر مایوس مریض شفایاب اور بوڑھے بالکل جوان ہو جاتے ہیں، اور ان کی عمر بہت طویل ہو جاتی ہے، البیرونی اس فن کی تفصیل لکھ کر یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ رسائن کی حرص میں جاہل راجہ معصوم بچوں کو بے تکلف آگ میں جھونکوا دیتے تھے۔ (عربی ص ۹۴ اردو ترجمہ جلد ۱ ص ۲۵۶)

جھاڑ پھونک کے سلسلہ میں رقمطراز ہے کہ جھاڑ زیادہ تر اس شخص کے لیے ہوتی ہے جس کو سانپ بچھو نے کاٹا ہو، اس بارہ میں یہ لوگ اس قدر مبالغہ کرتے ہیں کہ ایک شخص نے خود ہم سے کہا کہ اس نے ایک مردے کو جو سانپ کے کاٹے سے مرا تھا، دیکھا کہ مرنے کے بعد اسکو جھاڑا گیا اور وہ جی اٹھا۔ اور دنیا میں زندہ اور دوسروں کی طرح چلتا پھرتا رہا (عربی ص ۹۰ اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۵۰)۔ البیرونی کو خود جھاڑ پھونک پر اعتقاد نہیں تھا لیکن اس کے بعض واقعات کی تفصیل مزے لے کر لکھی ہے۔

برہمن کی زندگی کا گہرا مطالعہ

البیرونی کے یہ تمام بیانات ہندوؤں کے عوام سے متعلق ہیں، اسکے بعد ہندوؤں کی چاروں ذات برہمن، چھتری، ویش اور شودر کی معاشرتی زندگی کی بھی علیحدہ علیحدہ تصویریں کھینچی ہیں، برہمن کی زندگی کا مطالعہ بشن پران کی مدد سے کیا ہے، اور اس کے مختلف دور کی تفصیلات بڑے احترام سے لکھی ہیں، جو اجمالاً یہ ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ برہمن کی معاشرت ایک مذہبی معاشرت تھی، یعنی ان کی معاشرت ان کے مذہب سے الگ نہ تھی،

کتاب کے باب ۶۳ میں ہے کہ برہمن کی زندگی کے چار دور ہوتے ہیں۔ پہلا آٹھ سال کی عمر پر ختم ہوتا ہے، جب وہ آٹھ سال کا ہوتا ہے تو برہمن جمع ہو کر اس کی کمر میں زنار باندھتے ہیں، اور گلے میں ایک جوڑا جنجوی یعنی جنیو پہناتے ہیں، جو بٹے ہوئے دھاگے کا ہوتا ہے، ایک جنیو بائیں کاندھے پر رکھ کر داہنی بغل کے نیچے لے آیا جاتا ہے، یہ کپڑے کا بنا ہوا ہوتا ہے، جنیو

پہناتے وقت ایک لکڑی برہمن بچے کے ہاتھ میں دیجاتی ہے جس کو وہ پکڑے رہتا ہے، پھر وہ گھاس کی ایک انگوٹھی اس کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں پہنائی جاتی ہے، یہ انگوٹھی سپر کہلاتی ہے، اس سے یہ غرض ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھ سے جو کچھ دیا جائے گا اس میں برکت ہوگی، جنیو کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، برہمن کسی حال میں بھی اس کو جدا نہیں کرسکتا، اگر کبھی اتار دے تو گنہگار ہوجاتا ہے، اور سوبرت رکھے یا صدقے کا کفارہ ادا کیے بغیر پاک نہیں ہوسکتا؛

وہ اپنی عمر کے ۲۵ ویں سال اور بعض کے نزدیک ۴۸ سال تک زہد اختیار کرنے کے لیے بڑی محنت و ریاضت کرتا ہے، جابجا گھومتا رہتا ہے، دن رات کسی گرو کی خدمت میں اس کے لیے رہنا ضروری ہے، بید اور اس کی تفسیر کو سیکھنا بھی اس کے لیے لازمی ہے، روزانہ تین بار غسل کرنے کا عادی ہوتا ہے، صبح شام دونوں وقت آگ کی پوجا کرتا ہے، پھر استاد کے پاس جاکر سربسجود ہوتا ہے، ایک دن بیچ کرکے روزے رکھتا ہے، گوشت مطلق نہیں کھاتا ہے، گرو کے گھر پر جب رہتا ہے تو وہاں سے صرف ایک مرتبہ دوپہر یا شام کے وقت پانچ گھروں سے بھیک مانگنے باہر نکلتا ہے، جو کچھ ملتا ہے پہلے اس کو استاد کے سامنے لاکر رکھ دیتا ہے، وہ کچھ تو اپنے لیے پسند کرلیتا ہے، بقیہ اس کو دیدیتا ہے، آگ کی پوجا کے لیے پلاس اور درب کے درختوں کی لکڑی فراہم کرتا رہتا ہے، ۲۵ سال کے بعد وہ اپنی زندگی کے دوسرے دور میں داخل ہوتا ہے، جو پچاس اور بعض کے نزدیک ستر سال تک باقی رہتا ہے، اس دور میں اسکو اپنے گرو سے بیاہ کرنے کی اجازت ملتی ہے، جس کے بعد وہ گھرستی کی زندگی اختیار کرتا ہے، اس کو بیاہ کرنے کی اجازت اس شرط پر ملتی ہے کہ اس کی نیت اولاد پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہ ہو، اس کے لیے ایسی عورت سے بیاہ کرنا جائز نہیں جس کی عمر بارہ برس سے

زیادہ ہو، اس دور میں وہ اپنی معاش کے لیے برہمنوں اور چھتریوں کو تعلیم دیتا ہے، لیکن تعلیم دینے کے سلسلے میں اس کے لیے اجرت لینا جائز نہیں، وہ نذرانے لے سکتا ہے، وہ برہمن بنکر بادشاہوں اور رئیسوں سے بھی نذرانے قبول کرسکتا ہے، بشرطیکہ اس کے مانگنے میں اسکی طرف سے اصرار اور دینے والے کے لیے جبر نہ ہو، وہ مجبوری کی حالت میں کپڑے یا سپاری کی تجارت بھی کرسکتا ہے، لیکن تجارت میں دغا اور فریب بھی کرنا پڑتا ہے، اس لیے بہتر ہے کہ وہ اپنی تجارت کسی بیش کے ذریعہ کرائے، اس کے لیے مویشی اور جائداد رکھنا یا سود سے فائدہ اٹھانا حرام ہے، نیل کا رنگ اس کے لیے ناپاک ہے، اگر اس کے بدن پر لگ جائے تو اس کے لیے غسل کرنا واجب ہے، اس کی زندگی کا تیسرا دور پچاس برس سے پچھتر برس یا بعض کے نزدیک نوے برس تک رہتا، اس دور میں وہ دنیا ترک کردیتا ہے، بیوی بچوں کو چھوڑکر جنگل کی راہ لیتا ہے، چھت کے بجائے آسمان کے نیچے رہتا ہے، درخت کے پتوں سے صرف ستر چھپائے رکھتا ہے، زمین پر بستر کے بغیر سوتا ہے، اور صرف پھل، ساگ پات اور ان کی جڑیں کھاتا ہے، بال بڑھا لیتا ہے، اور ان میں تیل نہیں لگاتا،

اس کی زندگی کا چوتھا اور آخری دور ہوتا ہے، اس دور میں وہ سرخ کپڑا پہنتا ہے ہاتھ میں سونا رکھتا ہے، برابر دھیان یعنی فکر میں لگا رہتا ہے، قلب کو دشمنی اور ذہن کو حرص، ہوس، غضب سے پاک رکھتا ہے تاکہ وہ نجات ابدی حاصل کرے اور دنیا کی طرف رجوع نہ ہو، اس کو کسی دنیاوی کام سے سروکار نہیں ہوتا ہے، ثواب کی خاطر کسی گاؤں میں جاتا ہے تو ایک دن سے زیادہ اس کے لیے ٹھہرنا جائز نہیں، شہر میں پانچ دن قیام کرسکتا ہے، اس قیام میں کوئی اس کو کوئی چیز دے تو اس میں سے دوسرے دن کے لیے کچھ باقی نہ رکھے۔

برہمن کے عام فرائض یہ ہیں کہ زندگی بھر نیک کام کرتا رہے، صدقہ دے اور صدقہ لے،

ہمیشہ کچھ نہ کچھ پڑھتا رہے، قربانیاں انجام دے، آگ کی نگرانی کرتا رہے، اس کو بجھنے نہ دے، آگ مرنے کے بعد اسی میں جلایا جائے، اسی کا نام ہوم ہے، صبح کو اٹھ کر نہائے، تاکہ سوتے وقت بدن کے سوراخ ڈھیلے ہو جانے سے جو نجاست پیدا ہو گئی ہو وہ دور ہو جائے، نہا کر آفتاب کی طرف دونوں ہتھیلیوں کو جوڑ کر دونوں انگوٹھوں پر اپنی رسم کے مطابق سجدہ کرے، کیونکہ آفتاب ہی ان کے نزدیک قبلہ ہے، رخ دکھن کے علاوہ کوئی اور طرف ہو، دکھن کی طرف کوئی نیک کام نہیں کیا جاتا ہے۔ دوپہر کے وقت غسل کرنے سے ثواب حاصل ہوتا ہے اس لیے وہ اس وقت بھی نہائے، شام کا وقت رات کے کھانے اور نماز کا وقت ہوتا ہے اس لیے وہ شام کو بھی نہائے، گو دوپہر اور شام کا نہانا صبح کے نہانے کی طرح لازمی نہیں،

اس کو صرف دو دفعہ کھانا چاہئے، دوپہر اور رات کے وقت جب وہ کھانے پر بیٹھے تو ایک یا دو شخص خصوصاً اجنبی برہمنوں کے لیے صدقہ نکالے، کچھ جانوروں، چڑیوں، اور آگ کے واسطے علیحدہ کرے، بقیہ خدا کا نام لے کر خود کھائے اور جو بچ جائے، وہ حاجت مندوں کے لیے باہر رکھ دیئے تاکہ جو بھی اس طرف سے گذرے، خواہ انسان ہو یا جانور اس کو کھالے، برہمن کے کھانے پینے کا برتن بالکل علیحدہ ہو، اس کو ایسے ملک میں رہنا جائز نہیں جہاں وہ گھاس پیدا نہیں ہوتی ہو جس کی انگوٹھی وہ اپنی چھوٹی انگلی میں پہنتا ہے، اور جس کے اندر کالے بال کے ہرن نہ چرتے ہوں، گھر میں ہر کھانے والے برہمن کی جگہ یعنی منڈل کو گوبر سے لیپا جاتا ہے، اس کی شکل مربع ہوتی ہے، کھانے کے بعد وہ دھویا اور لیپا جاتا ہے، تاکہ جگہ پاک ہو، برہمن کے لیے پیاز، لہسن ، کدو، گرنجن اور نالی جیسی ترکاریاں کھانا بالکل حرام ہے۔ (عربی ص ۲۷۰-۲۷۲ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۱۰-۳۰۳)

چھتری کی زندگی کا مطالعہ | چھتری، بیش اور شودر کے معاشرتی حالات لکھنے میں البیرونی نے کچھ بخل

...ے کام لیا ہے، شاید اس لیے کہ وہ برہمنوں سے زیادہ متاثر رہا ہو، لکھتا ہے کہ چھتری بید پڑھنا سیکھ سکتا ہے، لیکن اس کی تعلیم نہیں دے سکتا، وہ پران کے ان احکام کی بھی پابندی کر سکتا ہے، اس کا جو کا مثلث ہوتا ہے، اس کے ذمہ حکومت کرنا اور لوگوں کی حمایت میں لڑنا ہے، جب وہ بارہ برس کا ہوتا ہے تو ایک جنیو میں دھاگے کا اور ایک موٹے کپڑے کا جنیو پہنایا جاتا ہے، (عربی ص ۲۷۰ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۱۱)

بیش کے فرائض | بیش کا کام کاشتکاری، مکان بنانا، مویشی کی رکھوالی اور برہمنوں کی حاجتیں پوری کرنا ہے، اس کے لیے صرف دو دھاگے کا جنیو پہننا جائز ہے، (عربی ص ۲۷۰ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۱۱)

شودر کی حیثیت | شودر کی حیثیت برہمن کے غلام کی ہے، اس کے لیے مالا جپنا، بید پڑھنا اور آگ کی قربانیاں کرنا منع ہے، اگر شودر یا بیش کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے بید پڑھا تو برہمن کی اطلاع پر حاکم اس کی زبان کاٹ لیتا ہے، البتہ اللہ کا ذکر اور نیک کام کرنا یا صدقہ دینا اس کے لیے منع نہیں ہے، وہ جنیو بھی پہن سکتا ہے، لیکن موٹے کپڑے کی ایک فرد سے زیادہ نہ ہو (عربی ص ۲۷۱ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۱۲-۳۱۱)

البیرونی کو اس تفریق سے دکھ پہنچا تھا، اس لیے خود ایک ہندو عالم کے ذریعہ سے اس کو یہ لکھ کر غلط قرار دیا ہے کہ یہ سارا تفرقہ درجات کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے، جس میں ایک شخص دوسرے کو مسخر یا محکوم بنا لیتا ہے، ورنہ باسدیو نے طالب نجات کے حق میں کہا کہ "عقلمند کے نزدیک برہمن اور چنڈال، دوست اور دشمن، امانتدار اور خائن، سانپ اور نیولا برابر ہیں، اور اگر عقل سب کو مساوی ٹھہراتی ہے تو فرق اور برتری جہالت کی پیدا کی ہوئی ہے، (عربی ص ۲۷۱ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۱۳)

شودر کے متعلق البیرونی کا بیان ہے کہ ہندوؤں میں مال کو سود سے بڑھانا حرام ہے اور اس ذریعہ سے اصل مال پر جس قدر زیادہ گناہ ہوگا، صرف شودر کو اس شرط کے ساتھ سود لینے کی اجازت ہے کہ نفع راس المال کے پچاسویں حصہ سے بڑھنے نہ پائے، (عربی ص ۲۷۶ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۲۸)

ہندوؤں کے نزدیک حلال و حرام چیزیں

ہندوؤں کے کھانے پینے کی حلال و حرام چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے البیرونی کی معلومات یہ ہیں کہ بکری، بھیڑ، ہرن، خرگوش، گینڈا، بھینس، مچھلی، پانی کے پرندے، گوریا، فاختہ، بٹیر، کبوتر اور مور مباح ہیں، گائے، گھوڑا، خچر، گدھا، اونٹ، ہاتھی، پلی ہوئی مرغی، کوا، طوطا، کوئل، انڈے اور شراب حرام ہیں، (عربی ص ۲۷۶ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۳۰)

تعجب ہے کہ البیرونی نے ہندوؤں کے لیے بھینس کو بھی حلال بتایا ہے، حالانکہ اب ان کے لیے گائے کی طرح بھینس بھی حرام ہے، البیرونی نے بعض لوگوں کے قول کے مطابق لکھا ہے کہ مہا بھارت کی لڑائی سے پہلے گائے ہندوؤں میں حلال تھی، اور بعض قربانیوں میں گائے ذبح کی جاتی تھی، پھر حرام کر دی گئی، اس کے حرام ہونے کی ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ گائے کا گوشت ثقیل ہوتا ہے، برہمن اس کو کھا کر آسانی سے ہضم نہیں کر پاتے تھے، اس لیے اس کو حرام قرار دیا گیا، مگر خود البیرونی نے اپنی طرف سے یہ لکھا ہے کہ اس کا بچھڑا سفر، باربرداری اور کاشتکاری کے کام آتا ہے، خود دودھ دیتی ہے، جو خانہ داری میں استعمال ہوتا ہے، اس کے گوبر سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، اور یہ عجیب بات لکھی ہے کہ اس کی سانس سے بھی جاڑے کے دنوں میں استفادہ کیا جاتا ہے، ان ہی باتوں سے وہ حرام قرار دی گئی (عربی ص ۲۷۷ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۳۰-۳۱)

ہندوؤں کے شادی بیاہ کے طریقے

کتاب کے باب ۶۹ میں ہندوؤں میں شادی بیاہ کا ذکر کرتے ہوئے البیرونی لکھتا ہے کہ ان میں بیاہ کم سنی میں ہوتا ہے، اس لئے اس کو والدین انجام دیتے ہیں، اس تقریب میں برہمن قربانی کی رسمیں ادا کرتے ہیں، برہمن اور غیر برہمن کو خیرات بانٹی جاتی ہے، خوشی کے آلات بجائے جاتے ہیں، مہر کا رواج نہیں، جو حصے کے مطابق عورت کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے، اس وقت جو کچھ دیا جاتا ہے، واپس لینا جائز نہیں ہوتا تاوقتیکہ عورت خود اپنی خوشی سے ہبہ نہ کر دے، شوہر اور بیوی کے درمیان موت کے سوا تفریق نہیں ہوتی، ان کے یہاں طلاق نہیں ہے (عربی ص ۲۷۸ اردو ترجمہ ص ۲۳۳-۳۴)

البیرونی نے ایک طرح سے یہ تعجب انگیز بات لکھ دی ہے کہ ہندو مرد کو حق ہے کہ ایک سے زیادہ چار بیوی تک کرے، چار سے زیادہ نہیں کر سکتا (عربی ص ۲۷۸) البیرونی نے اس کی سند میں کسی مذہبی کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس نے کسی سند ہی کی بنا پر لکھا ہوگا، عام خیال یہ ہے کہ تعدد ازدواج اسلام ہی میں ہے، ہندو مذہب میں نہیں، لیکن البیرونی کے اس بیان سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے کہ برہمن کے لئے چار، چھتریوں کے لئے تین، ویش کے لئے دو اور شودر کے لئے ایک بیوی جائز ہے، (عربی ص ۲۷۹) بیوہ کو دوسری شادی کا حق نہیں ہے، وہ یا تو زندگی بھر بیوہ رہے، یا جل کر ہلاک ہو جائے (عربی ص ۲۷۸) بیاہ کم رشتہ قرابت مندوں میں نہیں ہونا چاہئے، بلکہ ان میں اچھا ہے جو نسب سے بہت دور ہوتے ہیں، ہر طبقہ کے لئے خود اپنے طبقہ اور اس سے نیچے طبقے میں بیاہ کرنا جائز ہے، اوپر کے طبقہ میں کرنا جائز نہیں ہے، (عربی ص ۲۷۸) اولاد ماں کی طرف منسوب ہوتی ہے، باپ کی طرف نہیں، یعنی اگر برہمن کی بیوی برہمن ہے تو اولاد بھی برہمن ہوگی، اور اگر شودر ہے تو اولاد بھی شودر ہوگی، لیکن برہمن اپنے طبقہ سے باہر بیاہ نہیں کرتے (عربی ص ۲۷۸)

بچہ کی پیدائش اور عقیقہ وغیرہ کے مراسم
ایام حمل کے چوتھے مہینے بچہ کے لئے قربانی دی جاتی ہے، اس کو سیمی تونتن کہا جاتا ہے، (عربی ص ۲۷۶) بچہ جب پیدا ہوتا ہے، تو ولادت ہونے اور دودھ پلانے کے درمیان بھی قربانی کیجاتی ہے، جس کا نام جات کرم ہے، (عربی ص ۲۷۹) جب عورتوں کا نفاس ختم ہو جاتا ہے تو بچہ کا نام رکھا جاتا ہے، اس وقت بھی قربانی کی جاتی ہے، جس کو نام کرم کہا جاتا ہے، (عربی ص ۲۷۹) جب تک عورت نفاس کی حالت میں رہتی ہے، کسی برتن کے پاس نہیں جاتی ہے نہ اس کے گھر کے اندر کوئی چیز کھائی جاتی ہے، اور نہ برہمن اس کے گھر میں آگ سلگاتا ہے، (عربی ص ۲۷۹) رضاعت کی مدت زیادہ سے زیادہ تین برس ہے، عقیقہ تیسرے برس ہوتا ہے، کان چھیدن کی رسم ساتویں یا آٹھویں برس ہوتی ہے (عربی ص ۲۷۹)

سزاؤں کے طریقے
البیرونی کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ قتل، چوری، شراب خواری اور زنا کے لئے سخت سزاؤں کے قوانین تھے، اگر قاتل برہمن اور مقتول دوسری ذات کا ہوتا، تو برہمن کو سزا تو نہیں دیجاتی، لیکن اس کو کفارہ ادا کرنا پڑتا، وہ برت رکھتا، صدقے ادا کرتا اور عبادت میں مشغول رہتا، اگر مقتول بھی برہمن ہوتا تو یہ گناہ کبیرہ سمجھا جاتا، جس کو کفارہ بھی دور نہیں کرتا، اس کی سزا آخرت میں ملتی، (عربی ص ۲۸۰-۸۱) برہمن کے قتل کے بعد سب سے بڑا گناہ گائے کو ہلاک کرنا سمجھا جاتا ہے، (عربی ص ۲۸۱) اس کے بعد شراب خواری اور زنا کا گناہ تھا، برہمن یا چھتری شراب یا زنا کے مرتکب ہوتے تو ان کا مال ضبط کرکے ان کو ملک سے باہر نکال دیا جاتا، برہمن اگر چوری کرتا، تو اس کی آنکھیں نکلوا لیجاتیں، پھر اس کا ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کٹوا دیا جاتا، ان دونوں کے علاوہ اور چوروں کو قتل کر دیا جاتا، زانیہ عورت شوہر کے گھر سے نکال دیجاتی اور وہ جلاوطن رہتی (عربی ص ۲۸۱)

وراثت
میراث کے متعلق ہندوؤں کا اصول ایسا ہے کہ بیٹی کے سوا اور سب عورتیں وراثت

سے محروم ہو جاتی ہیں، منو کی کتاب میں ہے کہ بیٹی کا حصہ بیٹے کے حصہ کا ایک ربع ہے (عربی ص ۲۸۲) میت کے وارث صرف مرد ہو سکتے ہیں، اصول یہ ہے کہ میت کے نیچے والوں کا حق زیادہ قوی ہے اور وہ بہ نسبت اوپر والوں کے ترکہ کے زیادہ مستحق ہیں، یعنی بیٹی اور بیٹے کی اولاد کو باپ دادا پر ترجیح ہے، پھر جو اشخاص اوپر یا نیچے ایک ہی جانب میں ہیں، ان میں جو لوگ میت سے زیادہ قریب ہیں، ان کی نسبت زیادہ مستحق ہیں، جو اس سے دور ہیں، یعنی بیٹا بہ نسبت پوتے کے اور باپ بہ نسبت دادا کے زیادہ مستحق ہیں، جو لوگ نسبت کے سیدھے سلسلہ سے ادھر ادھر ہٹ گئے ہوں جیسے بھائی وہ ضعیف ہیں اور صرف اس وقت وارث ہوتے ہیں، جب قوی وارث نہیں ہوتا، اس طرح بیٹی کا بیٹا بہن کے بیٹے سے اور بھائی کا بیٹا ان دونوں سے زیادہ مستحق ہے، اگر متعدد وارث ہوں تو سب کے درمیان برابر حصے تقسیم کیے جاتے ہیں، اگر میت کا کوئی وارث نہیں ہوتا تو اس کا ترکہ حکومت کے پاس چلا جاتا ہے، مگر لاوارث برہمن کے مال پر حکومت قبضہ نہیں کر سکتی ہے وہ صدقہ کر دیا جاتا ہے (عربی ص ۲۸۲)

وارث پر میت کے یہ حقوق ہیں کہ اس کے مرنے کے وقت سے دس دن تک روزانہ پکا ہوا کھانا اور پانی کا ایک کوزہ کھلے آسمان کے نیچے ایک برآمدہ نما جگہ پر رکھ دیا جائے کہ شاید روح کو ابھی کسی جگہ قرار نہیں ہوا ہو، اور وہ بھوک یا پیاس سے گھر کے اردگرد چکر لگا رہی ہو، دسویں دن میت کے نام پر کھانا اور ٹھنڈا پانی صدقہ کریں اور گیارہویں دن سے ایک سال تک ایک آدمی کے کھانے کے برابر کھانا اور ایک درہم کسی برہمن کے گھر بھیجتے رہنا چاہئے، (عربی ص ۲۸۲ اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۴۷-۴۹) اس کے مرنے کے بعد وارث کو سولہ ضیافتیں دینا ضروری ہوتا ہے جن میں کھانا کھلانے کے علاوہ کھانے والوں کو صدقہ بھی دیا جاتا ہے، پہلی ضیافت موت کے گیارہویں دن اور دوسری پندرہویں دن ہوتی ہے، پھر ہر مہینہ ایک مرتبہ

دیجاتی ہے، چھٹے مہینے کا کھانا بہت عمدہ ہوتا ہے، ایک ضیافت سال کے ختم ہونے کے ایک دن پہلے ہوتی ہے، پھر سال تمام کا کھانا ہوتا ہے، ان ضیافتوں سے میت کے حقوق ادا ہوجاتے ہیں، لڑکے علاوہ وارث بیٹا سال بھر غم مناتا ہے، بیوی کے پاس نہیں جاتا، پھر سال کی ابتداء میں ایک دن کھانا اس کے لئے حرام ہوجاتا ہے، (عربی ص ۲۸۷، اردو ترجمہ ۳۴۷-۳۴۹)

ہندوؤں کے تہواروں کے مراسم

البیرونی نے ہندوؤں کے تہواروں کا ذکر باب ۷۶ میں بہت تفصیل سے لکھا ہے، ان کے ہر تہوار کو عید کے نام سے یاد کیا ہے، ان میں سے بعض تہواروں کی خبر تو شاید بہت سے موجودہ دور کے ہندوؤں کو بھی نہ ہوگی، ہم نے ان تہواروں کے نام کا املا البیرونی ہی کے املا کے مطابق لکھدیا ہے، لیکن ان کے بہت سے نام مثلاً چیت، جشٹ، بھندر روپ پنچہ، اہاری، بہائی، اہوی، گکاے بٹ، درویہر، پربت، گوتا تھیدا، اشتنک، ساگارتم، ماوتریچ، مانہرکیا، پالہ تن، اوراوربوتین، آج کل کے تہواروں کے نام سے بالکل مختلف ہیں، یہ تمام الفاظ زخاؤ کے بیان کے مطابق ہندی الاصل ہیں جیساکہ کتاب الہند ہیں، اس کے تیار کردہ انڈکس سے ظاہر ہوگا، ان ناموں کے اختلاف کی وجہ معلوم نہیں ہوسکی، بعض تہواروں کی تاریخ بھی اس زمانہ سے مختلف ہے، ہندی مہینہ کی ترتیب میں کچھ نہ کچھ تھوڑا سا فرق ہے، ساون کے بعد آسن کا ذکر کیا گیا ہے، آسن سے مراد اشون یعنی کوار ہے، آج کل بھادوں کے بعد کنوار آتا ہے، اس کی معلومات کی کچھ تفصیلات یہ ہیں،

چیت کا دوسرا دن اہل کشمیر کے لئے عید کا دن ہے، اس کا نام اگدوس ہے، چیت کے گیارہویں دن کا نام ہنڈولی چیت ہے، اس دن باسدیو کے مندر پر جمع ہوکر اس کے بت کو اس طرح جھولا جھلاتے ہیں، جس طرح اس کو بچپن میں جھلایا جاتا تھا، گھروں میں بھی جھولے لگائے جاتے ہیں، اور لوگ خوش خوش جھولا جھلاتے رہتے ہیں، چیت میں پورے چاند کے دن کا نام بہنڈ

اس میں عورتیں سنگار کرکے اپنے شوہروں سے تحفہ طلب کرتی ہیں، چیت کے بائیسویں دن کا نام چیت جشٹ ہے، اس دن غسل کیا جاتا ہے، اور صدقے تقسیم ہوتے ہیں، جیٹھ کے تیسرے دن عورتیں غسل کرکے سنگار کرتی ہیں، اور مہادیو کی بیوی گور (یعنی گوری) کے بت کی پوجا کرتی ہیں، اس کے سامنے چراغ جلاتی اور خوشبو پیش کرتی ہیں، دن بھر بھوکی رہتی ہیں، جھولے سے دل بہلاتی ہیں، دوسرے دن صبح کو صدقہ کرکے کھاتی ہیں، جیٹھ کے دسویں دن برہمن میدانوں میں نکل کر قربانی کے لئے پانچ روز بہت سی آگ علٰحدہ علٰحدہ سولہ جگہوں پر سلگاتے ہیں، چار چار جگہوں کا ایک ایک حلقہ ہوتا ہے، ہر حلقہ میں ایک برہمن قربانی کا نگراں ہوتا ہے، وہاں سے سولہویں دن واپسی ہوتی ہے، اس مہینہ سبذت کی تقریب منائی جاتی ہے، اس میں برہمنوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے، جیٹھ کے پہلے اناج میں غلہ برکت حاصل کرنے کی خاطر پانی میں ڈالا جاتا ہے، جیٹھ کے مہینہ میں جب چاند پورا ہوجاتا ہے، تو اس کو روپ پنچہ کہتے ہیں، اس روز عورتیں جمع ہوکر خوشی مناتی ہیں، اساڑھ صدقہ کا مہینہ سمجھا جاتا ہے اسکا نام اہاری ہے، اس مہینہ میں برتن بدل کرنے کرائے جاتے ہیں، ساون میں جب چاند پورا ہوتا ہے، تو برہمنوں کو بلاکر کھانا کھلایا جاتا ہے، آسن (آشون یعنی کوار) کے آٹھویں دن کا تہوار باسدیو کی بہن مہانومی کے نام پر منایا جاتا ہے، اس دن گنا چوسا جاتا ہے، اور گنے کی پہلی پیداوار بھگت بت کے نذر کیجاتی ہے، اس روز صدقے بھی ہوتے ہیں، اور بکریاں بھی بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں، آسن کی پندرہویں تاریخ میں جب چاند اپنی آخری منزل ریوتی میں ہوتا ہے تو بہائی کا تہوار ہوتا ہے، اس روز کشتی لڑنے اور جانوروں کا تماشا دکھایا جاتا ہے، اسی تاریخ کو باسدیو کے ماموں کنس نے اس کو کشتی لڑنے کے لئے بلایا تھا، آسن کی سولہویں تاریخ کو برہمنوں کو صدقے دیئے جاتے ہیں، اس مہینہ کی ۲۳ ویں تاریخ کو اہوی کہا جاتا ہے، اس روز بھی کشتی لڑنے کی تفریح ہوتی ہے، بھادوں کے مہینہ میں جب

چاند دسویں منزل میں داخل ہوتا ہے، تو اس کو پتر پکش کہتے ہیں، اس میں بزرگوں کے نام پر
پندرہ دن تک صدقے کیے جاتے ہیں، بھادوں کے تیسرے دن کو ہریالی کہا جاتا ہے، عورتیں کئی
دن پہلے سے ہر قسم کا بیج ٹوکروں میں بوتی ہیں، اور جب ان میں کونپل نکل آتی ہے تو ان کو نکال
کر ان پر گلاب اور خوشبو چھڑکتی ہیں، رات بھر کھیل تماشا کرتی رہتی ہیں، دوسرے دن ان
سب کو تالاب پر لا کر غسل دیتی ہیں، خود بھی نہاتی ہیں، پھر صدقے تقسیم کرتی ہیں، بھادوں کی
چھٹی تاریخ کو گائے بت کہا جاتا ہے، اس دن کھانے کی ضیافت ہوتی ہے، بھادوں کے آٹھویں
دن جب چاند کا آدھا جسم روشن ہو جاتا ہے تو یہ دن دروب ہر کہلاتا ہے، اس روز غسل
کر کے اگا ہوا غلہ استعمال کیا جاتا ہے، اسی دن عورتیں حمل سے رہنے اور بیٹے کی آرزو کرتی
ہیں، بھادوں کے گیارہویں دن کا نام پربت ہے، یہ بڑا اہم دن سمجھا جاتا ہے، اس روز باسدیو
بت کا پوجاری اس دھاگے کو زعفران سے رنگتا ہے، جو اس کو دیا جاتا ہے، رنگتے وقت دھاگہ میں
کچھ جگہ خالی چھوڑ دیتا ہے، پھر باسدیو بت کے قد کے برابر ناپ کر اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے جو
اس کے قدم تک لٹک جاتا ہے، بھادوں کی سولہویں تاریخ کو لڑکے سنوارے جاتے ہیں، ان کو
خوشبو لگائی جاتی ہے، پھر ان جانوروں کے ساتھ کھیلنے کو کہا جاتا ہے، اس کے ساتویں دن
مرد بھی اپنی آرائش کرتے ہیں، مہینہ میں جتنا دن باقی رہ جاتا ہے اس کی ہر شام کو بھی لڑکے
سنوارے جاتے ہیں، برہمنوں کو صدقہ دیا جاتا ہے، اور نیک کام انجام دینے کی کوشش کیجاتی
ہے، جب چاند چوتھی منزل روہنی میں ہوتا ہے، تو وہ گونالہید کہلاتا ہے، اس کے تین دن تک
باسدیو کی پیدائش کی خوشی میں کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں، کاتک کے پہلے دن دیپالی (یعنی
دیوالی) منائی جاتی ہے، اس روز برج میزان میں آفتاب و ماہتاب اکٹھے ہوتے ہیں، اس دن لوگ
غسل کر کے اپنی آرائش کرتے ہیں، پان اور سپاری تحفے میں لوگوں کے پاس بھیجتے ہیں، صدقے کرتے

ہیں، دوپہر تک کھیل تماشے میں مشغول رہتے ہیں، رات کے وقت اس کثرت سے چراغ جلاتے ہیں
کہ ہوا تک روشن ہو جاتی ہے، ان کا خیال ہے کہ اس دن باسدیو کی بیوی لکشمی سروجن کے بیٹے راجہ
بل کو جو ساتویں زمین میں قید ہے آزاد کرتی ہے، اور دنیا میں نکال لاتی ہے، اس دن کو بل راج
یعنی بل کی حکومت بھی کہتے ہیں، عام لوگوں کا خیال ہے کہ راجہ بل کرتا جگ میں تھا جو خیر یعنی نیکی
کا زمانہ تھا، یہ دن اس زمانہ کے مشابہ ہو جاتا ہے، اسی لئے خوشی منائی جاتی ہے، کاتک میں جب چاند
کے پورے ہونے کا وقت گذر جاتا ہے، تو ضیافتیں ہوتی ہیں، اور بقیہ مہینہ کی نصف تاریک
میں عورتیں سنوری رہتی ہیں، ماگھ کے تیسرے دن گور (یعنی گوری) کے چاندی کے بتوں
کو ایک کرسی پر اکٹھا کیا جاتا ہے، عورتیں جمع ہو کر رات بھر کھیلتی رہتی ہیں، اور صبح کو صدقے
کرتی ہیں، ماگھ میں جب چاند پورا ہو جاتا ہے تو اس میں عورتیں جمع ہو کر خوشی مناتی ہیں، پوس
کے اکثر دنوں میں عورتیں کثرت سے پوہول پکاتی ہیں، جو ایک قسم کا میٹھا کھانا ہوتا ہے، پوس کے
نصف روشن کے آٹھویں دن کا نام آشتک ہے، اس دن کھانا باست یعنی مرتق یا پالک سے
پکایا جاتا ہے، اور برہمنوں کو بلا کر اسی سے ان کی خاطر مدارات کیجاتی ہے، پوس کے نصف
تاریک کے آٹھویں دن کا نام ساگارتم ہے، اس دن شلجم کھایا جاتا ہے، ماگھ کے تیسرے دن کا
نام ماہ تریج ہے، اس روز عورتیں بڑے لوگوں کے گھروں میں گور کے بت کے پاس جمع ہو کر
اس کے سامنے عمدہ قسم کے کپڑے، عطر اور کھانے رکھتی ہیں، علیحدہ علیحدہ مجمع میں پانی سے بھرے
ہوئے ایک سو آٹھ برتن رکھے جاتے ہیں، جب ان کا پانی ٹھنڈا ہو جاتا ہے، تو رات کے ہر
چوتھے حصہ میں اس سے چار مرتبہ غسل کرتی ہیں، پھر صبح کو صدقے کر کے لوگوں کو کھلاتی پلاتی
ہیں، ماگھ میں جب چاند پورا ہو جاتا ہے تو اس کا نام چاہاہ کہلاتا ہے، اس رات اونچے مکانات
پر آگ روشن کی جاتی ہے، ماگھ کی ۲۳ تاریخ انسٹک یا ماہانی کہلاتی ہے، اس دن گوشت

اور بڑی کالی ماش کی دعوتیں کیجاتی ہیں، ماگھ کی ۲۹ ویں تاریخ کو جب رات تھوڑی رہ جاتی ہے، تو سب لوگ پانی میں داخل ہو کر سات غوطے لگاتے ہیں، پھاگن کے آٹھویں دن کا نام پورارتک ہے، اس دن برہمنوں کی دعوت آٹے اور گھی کے مختلف کھانوں سے کیجاتی ہے، پھاگن کے مہینہ میں جب چاند پورا ہو جاتا ہے تو اس کو اوداہ یا ڈھولہ کہتے ہیں، اس رات چاہ سے نیچی جگہوں پر آگ روشن کرکے اس کو گاؤں کے باہر پھینک دیجاتی ہے، اس مہینے کی سولہویں رات کو شوراتری منائی جاتی ہے، رات بھر مہادیو کی پوجا ہوتی ہے، اس مہینہ کی ۲۳ ویں دن کا نام پوتین ہے، اس دن چاول کے ساتھ گھی شکر ملا کر کھایا جاتا ہے، ملتان کے ہندوؤں کا ایک خاص تہوار سانب پور ژاتر ہے، اس میں آفتاب کی پوجا ہوتی ہے (عربی ۲۰۷-۲۰۹، اردو ترجمہ جلد دوم ۲۶۳-۲۶۵)

ہندوؤں کے بعض نامناسب مراسم کی مدافعت

اوپر کی تفصیلات سے ظاہر ہوگا کہ ہندوؤں کی معاشرتی زندگی میں مذہب کی گہری چھاپ پڑی رہی، برہمن کی معاشرتی زندگی تو مذہب کے بالکل تابع رہتی، اس زندگی کی جو تصویر البیرونی نے کھینچی ہے، وہ تو ویدک کال کے برہمنوں کی زندگی معلوم ہوتی ہے، معلوم نہیں گیارہویں صدی عیسوی میں ہر برہمن کی زندگی بھی ویسی ہی تھی جیسی کہ البیرونی نے شاستروں کی مدد سے پیش کرکے قلم بند کر دی ہے، اگر ایسی ہی رہی تو وہ ضرور قابل قدر ہے، البیرونی خود بھی ان کی پاکیزہ زندگی سے متاثر معلوم ہوتا ہے، پھر اسکو اگر برہمنوں یا عام ہندوؤں کی زندگی سے متعلق بھی کچھ جاہلی یا نامناسب باتیں معلوم ہوتی ہیں تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی خوبصورت عذر بھی پیش کرتا رہتا ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے، کہ اس جاہلیت پر ہم تنہا ہندوؤں ہی کو ملامت نہیں کرتے، اہل عرب بھی زمانۂ جاہلیت میں ان ہی کے مانند بڑی بڑی نامناسب اور قابل شرم باتوں کے مرتکب ہوتے تھے (عربی ص ۱۰، اردو ترجمہ جلد اول ۲۴-۲۶)، جھاڑ پھونک کے سلسلہ میں لکھتا ہے، کہ ہندو اس کو

جادو سمجھتے ہیں، لیکن یہ لکھ کر یہ بھی تاویل کرتا ہے کہ اس معنی کے اعتبار سے سب قومیں جادو سمجھتی ہیں، یعنی اور قومیں بھی اپنے جھاڑ پھونک کو جادو سمجھتی ہیں، (عربی ص ۹۷، اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۵۹) مندروں میں کچھ بدچلن عورتیں رہتی تھیں، اس کے متعلق البیرونی کا بیان ہے کہ یہ خرابی ان کے راجاؤں کی پیدا کی ہوئی ہے، مندروں میں جو عورتیں رہتی ہیں، وہ گانے ناچنے اور دل بہلانے کی غرض سے ہیں، برہمن اور مہنت یا پجاری اس کے سوا اور کچھ یعنی زنا کاری ان کے حق میں پسند نہیں کرتے، لیکن ان کے راجاؤں نے ان کے شہروں کے واسطے آرائش اور لوگوں کے واسطے عیش و نشاط اور آزادہ روی کا ذریعہ بنا دیا ہے، جس سے ان کا مقصود ان کے ذریعہ سے خزانے کا فائدہ اور جو کچھ خزانے سے فوج کے واسطے باہر نکلتا ہے اس کو جرمانہ اور ٹیکس کے ذریعہ خزانے میں واپس لانا ہے، اس کی تنقیص کرنے کے بجائے البیرونی اس پر یہ لکھ کر پردہ ڈالنا چاہتا ہے کہ عضد الدولہ نے بھی یہی کیا تھا، اس کے علاوہ اس کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ فوج کے بن بیاہے سپاہیوں سے رعایا کی حفاظت ہو، (عربی ص ۲۷۹، اردو ترجمہ جلد دوم ص ۳۲۷-۲۸)

پہلے ذکر آیا ہے کہ ہندوؤں کے یہاں جب کوئی مرتا ہے تو اس کے لئے آسمان کے نیچے ایک برآمدہ نما جگہ پر مرنے کے وقت سے دس دن تک ہر روز کھانا اور پانی کا کوزہ رکھ دیا جاتا ہے، تاکہ اس کی روح کو اگر کسی جگہ قرار نہ ہو تو وہ اپنی بھوک اور پیاس کو گھر کے ارد گرد آکر رفع کرے، اس سلسلہ میں بیرونی لکھتا ہے کہ سقراط کے یہاں بھی اس قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں، اس کا خیال ہے کہ مقبرے کے گرد نفس اپنے بدن کی محبت میں چکر لگاتا رہتا ہے، نفس بدن کے ہر عضو میں سے کچھ نہ کچھ جمع کرتا ہے، چونکہ اس عالم میں اور بدن کی موت پر جب وہ اس سے جدا اور علحدہ ہوتا ہے، اس کے بعد کے عالم

میں اس کی سکونت کی جگہ بن جاتا ہے، (عربی باب ۷۲، اردو ترجمہ جلد دوم ص ۴۹-۳۴۸)

ایک جگہ البیرونی گنگا اور جمنا کے سنگم کے پاس ایک درخت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس درخت کے پاس لوگ اپنے آپ کو اس طرح ہلاک کرتے ہیں کہ اس پر چڑھ کر اپنے آپ کو دریائے گنگا میں گرا دیتے ہیں، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہے کہ جو کچھ میں نے ہندوؤں سے نقل کیا، بعینہ اسی قسم کی بات سقراط نے کہی ہے، کہ کسی شخص کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اپنے آپ کو قبل اس کے ہلاک کرے، کہ دیوتا اس کے واسطے ایسی اضطراری حالت یا مجبوری پیدا کر دیں، جیسی اس وقت ہمارے واسطے موجود ہو گئی ہے، سقراط نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم انسان ان لوگوں کی طرح ہیں جو قید ہیں، یہ مناسب نہیں کہ ہم لوگ بھاگیں، اور نہ یہ کہ اپنے نفس کو کھول دیں، اس لئے کہ دیوتا اس وجہ سے کہ ہم انسان ان کے خادم ہیں، ہماری طرف خاص توجہ رکھتے ہیں (عربی ص ۲۸۴، اردو ترجمہ دوم ص ۵۶-۳۵۵)

البیرونی کی تحریر ان تاویلات سے بلکہ اس کی زیر نظر کتاب کی ہر سطر سے اس کی کشادہ دلی اور بے تعصبی کا اظہار ہوتا ہے، اس کو پڑھتے وقت یہ بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مذہب کی برتری کے احساس کے ساتھ وہ ہندوؤں کی مذہبی، علمی اور معاشرتی زندگی کا مطالعہ کر رہا ہے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دور کا کوئی محقق اپنی غیر جانبداری سے ہر بات کو تحقیق کر کے لکھنے کی کوشش کر رہا ہے، مثلاً ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ ہم سنا کرتے تھے کہ جو ہندو غلام ممالک اسلامیہ سے بھاگ کر اپنے ملک اور دین میں واپس جاتا ہے تو کفارے کے طور پر اس پر روزہ فرض کیا جاتا ہے، اور گائے کے گوبر اور پیشاب اور دودھ میں چند روز تک اس کو گاڑ دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ ان میں خمیر اٹھ آتی ہے، اس وقت نجاست سے نکال کر اس کو اسی قسم کی چیزیں جن میں گاڑا گیا تھا کھلائی جاتی ہیں، اس سنی ہوئی روایت سے

البیرونی کو دکھ ہوا، اسی لئے اس نے اُس کی تحقیق کی جس کے بعد وہ لکھتا ہے، کہ اس قسم کی دوسری باتیں بھی ہم نے سنی تھیں، ہم نے ان کے متعلق برہمنوں سے پوچھا، انھوں نے انکار کیا، اور کہا کہ اس کے لئے نہ کوئی کفارہ ہے، اور نہ اس کی سابق حالت سے آنے کی اجازت ہے، اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے، اس لئے کہ برہمن چند روز شودر کے گھر میں کھانا کھا لیتا ہے، تو اپنے طبقہ سے گر جاتا ہے، اور اس میں کبھی واپس نہیں آسکتا، (عربی ص ۲۸۱، اردو ترجمہ جلد دوم ص ۴۵-۳۴۴)

البیرونی کی بے تعصبی کی تعریف

البیرونی کی کتاب میں ہندوؤں کے مذہبی، علمی اور معاشرتی حالات کے مطالعہ میں ہمدردی و محبت، سیر چشمی اور افہام و تفہیم کی جو خوشگوار فضا ہے، اس سے متاثر ہو کر پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی نے لکھا ہے کہ

"وہ اپنے مذہبی عقیدہ کی وجہ سے اچھے لوگوں کے کارناموں کو نظر انداز کرنا پسند نہیں کرتا تھا، جو دوسرے ماحول اور فضا میں پلے اور پھولے، اس کی یہ رواداری، بے تعصبی بلکہ بے لاگ پن ایسا وصف ہے، جس کے لئے ہندوؤں کو اس کا ممنون ہونا چاہئے، اور علمی دنیا بھی اس کی شکر گذار ہے، کہ اس کی خوبی اس کی صلاحیت و لیاقت سے زیادہ قیمتی ہے"

(البیرونی یادگار جلد، ایران سوسائٹی کلکتہ ص ۸۳)

البیرونی قوموں کی باہمی دوری اور بیگانگی کو ایک دوسرے کے لئے بہت مضر سمجھتا رہا، اس کا یہ سمجھنا بہت صحیح تھا، کیونکہ ایک دوسرے کی لاعلمی سے بیگانگی پیدا ہوتی ہے، بیگانگی آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرا کر دیتی ہے، جس سے ذاتی، نسلی، اجتماعی اور قومی خود بینی پیدا ہوتی ہے، اس کے بعد دل آزاری اور مردم بیزاری، آبرو ریزی اور خونریزی بھی شروع ہو جاتی ہے، جس کو قومی سرخ روئی کا نام دیدیا جاتا ہے، البیرونی نے اپنی کتاب کے باب

اول کے آغاز ہی میں لکھا ہے کہ بے تعلقی کی حالت میں جو چیز نہیں معلوم ہو سکتی ہے وہ میل جول کی حالت میں ظاہر ہو جاتی ہے، اسی میل جول کی فضا کو پیدا کرنے کی خاطر اس نے انتہائی عرق ریزی اور جانفشانی سے کتاب الہند لکھی، اگر ہندو اور مسلمان دونوں میں ہر زمانہ میں ایک ایک البیرونی پیدا ہوتے رہتے، تو آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی،

شہاب الدین غوری کی رواداری غزنویوں کے بعد ہندوستان میں غوری آئے، شہاب الدین غوری کی تلوار ملتان، انہلواڑہ، سیالکوٹ، بھٹنڈا، اور ترائن وغیرہ میں ضرور چمکی لیکن اسی کے واقعاتِ زندگی میں یہ واقعہ بھی غور کرنے کے لائق ہے، کہ جب نہروالا یعنی انہلواڑہ کی فتح میں ناکام رہ کر غزنین میں مقیم تھا، اور اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے جنگی تیاریوں میں مصروف تھا کہ کسی نے عرضی لکھ کر بھیجی کہ نہروالہ میں ایک مشہور سوداگر ہے، جس کا نام وسالہ ابہر ہے، وہ ہمیشہ لاکھوں کا مال تجارت کی غرض سے ان علاقوں میں بھجوایا کرتا ہے چنانچہ اس وقت بھی اس کا دس لاکھ کے قریب کا مال غزنین میں آیا پڑا ہے، اگر بادشاہ سلامت چاہیں تو اس مال کو ضبط کر کے خزانے میں بھجوایا جا سکتا ہے، اس سے نہ صرف خزانہ معمور ہوگا، بلکہ شاہی شان و شوکت میں اضافہ ہوگا، سلطان نے عرضی کی پشت پر لکھ دیا کہ

وسالہ ابہر کا یہ مال اگر نہروالہ میں ہوتا، اور وہاں اس پر قبضہ کیا جاتا تو ہمارے لئے حلال ہوتا، لیکن غزنین میں اس مال پر قبضہ کرنا ہمارے لئے حرام ہے، کیونکہ وہ میری پناہ میں ہے، (جوامع الحکایات و لوامع الروایات اردو ترجمہ نسخہ دار المصنفین، ورق ۴۹ اردو ترجمہ حصہ اول ص ۱۴۴)

(باقی)

اراضیِ ہند کی شرعی حیثیت

چند قدیم تحریریں

از

جناب نور الحسن صاحب راشد کاندھلوی

اراضی ہند کا مسئلہ کئی سو سال تک علماء کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے، متعدد علماء نے اس موضوع پر دادِ تحقیق دی، قدیم علماء میں شیخ جلال الدین[1] تھانیسری نے "تحقیق اراضی الہند" کے نام سے ایک مختصر جامع اور پُرمغز رسالہ تحریر فرمایا تھا، یہ رسالہ

---

[1] شیخ جلال الدین بن قاضی محمد (رحمی) فاروقی تھانیسری، شیخ عبد القدوس گنگوہی (متوفی ۹۴۵ھ) کے خلیفہ اور بلند پایہ علماء میں سے تھے، اکبر نے جب اپنے بھائی حکیم مرزا پر فوجکشی کی تو وہ راستہ میں شیخ جلال سے ملا تھا، شیخ جلال نے تمام عمر درس و تدریس کا بازار گرم رکھا، آخر عمر میں نہایت ضعیف اور کمزور ہو گئے تھے ۹۵ سال کی عمر میں ۱۴ ذی الحجہ ۹۸۹ھ مطابق ۱۵۸۱ء میں انتقال ہوا، شیخ الاولیاء سے تاریخ وفات نکلتی ہے، تھانیسر میں اپنی خانقاہ کے صحن میں مدفون ہیں، اراضی ہند کے علاوہ متعدد درسی کتابوں کے حواشی اور تصوف میں ارشاد الطالبین علمی یادگار ہے:

شیخ جلال نے تھانیسر (کروکشیتر) میں کورپانڈو کے مشہور تاریخی قلعہ پر قیام فرمایا تھا، وہیں آپ کی عظیم الشان خانقاہ، مسجد اور مدرسہ تھا، مسجد میں آج کل ایک بھنگن مقیم ہے، مدرسہ کی بھی پکی عمارت

بہت کمیاب ہے، صرف چند کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں، مؤلف کا قریب العہد قلمی نسخہ ان کے خاندانی اعزہ کے ذخیرۂ کتب میں چند سال پہلے موجود تھا، مگر اس وقت دستیاب نہ ہو سکا، اس نسخہ کی ایک نقل کتب خانہ مظاہر العلوم میں اور ایک ہمارے مختصر سے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے،

یہ رسالہ ۱۳۰۲ھ میں مطبع احمدی میں طبع بھی ہو چکا ہے، مگر اس قدر غلط چھپا ہے کہ اس سے صحیح مفہوم اخذ کرنا بہت دشوار ہے، چار پانچ سال قبل اسی مطبوعہ نسخہ کو بنیاد بنا کر کراچی (پاکستان) سے مع متن اردو ترجمہ شائع کیا گیا ہے،

تحقیق اراضی الہند کی تالیف کے بعد بھی علماء نے اپنے فتاویٰ اور تالیفات کے ذریعہ اراضی ہند کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی، اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی

(بقیہ حاشیہ صفحہ) کا بھی یہی حال ہے، مزار کا مجاور ایک ہریجن بنا ہوا ہے، اس نے قبۂ مزار کے اندر ہی بود و باش کی جگہ بنائی ہے، یہ حال دیکھ کر بڑی عبرت ہوتی ہے، مزار کا قبہ خستہ حال تھا، ایک صاحب خیر نے حال میں اس کی مرمت کرا دی ہے، جس سے مزار محفوظ ہو گیا، تفصیل کے لئے دیکھئے اخبار الاخیار شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۲۷۳، مطبع محمدی دہلی ۱۲۸۳ھ، سفینۃ الاولیاء شہزادہ دارا شکوہ ص ۱۰۱-۱۰۲، نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۲ء، خزینۃ الاصفیاء مفتی غلام سرور لاہوری ص ۳۴۵ جلد ۲ نولکشور ۱۸۷۳ء، انوار العارفین مولوی محمد حسین مرادآبادی ص ۳۴۶ نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۶ء، نزہۃ الخواطر مولانا عبد الحی رائے بریلوی ص ۸۲-۸۳ جلد ۲، تاریخ مشائخ چشت پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۲۲۴-۲۲۵، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۳ء، شیخ عبد القدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات مولانا اعجاز الحق قدوسی ص ۵۳۵، ۵۳۹، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۱ء،

قاضی ثناء اللہ[۱] پانی پتی کے وہ فتاوے ہیں جن کے بارے میں ذیل کی سطور لکھی جا رہی ہیں:-

---

[۱] قاضی محمد ثناء اللہ بن مولوی حبیب اللہ بن مولوی ہدایت اللہ عثمانی پانی پتی کی ۱۱۴۳ھ میں پیدائش ہوئی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ۱۱۷۶ھ) سے علوم ظاہری اخذ کئے، ۱۶ سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہو گئے، باطنی علوم میں شیخ عابد سنامی (متوفی ۱۱۶۰ھ) سے استفادہ کیا، پھر شیخ کے فرمان کے مطابق حضرت مرزا مظہر جانجاناں (متوفی ۱۱۹۵ھ) سے اکتساب فیض کیا، حضرت مرزا صاحب کو قاضی ثناء اللہ سے بیحد تعلق تھا، علم الہدیٰ کے لقب سے یاد کرتے تھے، اور فرماتے اگر خدا پرسد کہ در درگاہ ما چہ تحفہ آوردی، عرض کنم ثناء اللہ پانی پتی را، قاضی ثناء اللہ کا ۸۲ سال کی عمر میں رجب ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں انتقال ہوا[عہ]، مزار مبارک پانی پت میں شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی (متوفی ۷۶۵ھ) کی درگاہ کے قریب ایک بڑے احاطہ میں ہے، قاضی صاحب کے برابر ہی مرزا مظہر جانجاناں کی دوسری اہلیہ مدفون ہیں، ۱۹۴۷ء کے بعد اس احاطہ کی کیفیت ناگفتہ بہ تھی، خدا جزائے خیر دے، ایک ترکی عالم نے اس کی مرمت کرا کے محفوظ کرا دیا، قاضی ثناء اللہ کی چونتیس (۳۴) تالیفات کا علم ہو سکا ہے، جن میں سے اکتیس (۳۱) کے قلمی یا مطبوعہ نسخے راقم سطور کی نظر سے گذرے ہیں، قاضی صاحب کی مشہور تالیف حقوق الاسلام کا مؤلف کا تصحیح کردہ قلمی نسخہ راقم کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے، قاضی صاحب کی تالیفات میں حدیث مظہری، تفسیر مظہری اور الاخذ بالاقوی (دفعہ میں) امتیازی حیثیت رکھتی ہیں، حدیث مظہری کا قلمی نسخہ بہرائچ میں موجود ہے، الاخذ بالاقوی کے کسی نسخہ کا سراغ نہیں ملتا، تفسیر مظہری سب سے پہلے نصف اول دو جلدوں میں حصار سے پھر میرٹھ سے، اور آخر میں مکمل شکل میں دہلی سے طبع ہوئی ہے، تفسیر مظہری کے اردو میں متعدد ترجمے ہوئے، آخری اور مکمل ترجمہ مولانا عبد الدائم جلالی کا ہے، قاضی صاحب کی چند تالیفات اور تفسیر مظہری کے مسودہ کی زیارت کیلئے راقم سطور

[عہ] تذکرہ اولیائے ہند مؤلفہ مرزا محمد اختر دہلوی کیرانوی میں ص ۲۳۱ پر قاضی صاحب کی وفات ۱۲۱۶ھ تحریر ہے، یہ صحیح نہیں ہے،

ان فتاوی کا شان نزول یہ ہے کہ قاضی محمد اعلیٰ تھانوی[1] مؤلف کشاف اصطلاحات الفنون

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۱) مولانا شاہ زید ابوالحسن فاروقی (خانقاہ حضرت شیخ ابوالخیر دہلی) کا ممنون ہے، (تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو مقامات مظہری از شاہ غلام علی ص ۷۵ تا ۷۸، مطبع احمدی دہلوی ۱۲۶۹ھ، خزینۃ الاصفیاء ص ۶۰۹ - ۶۰۸، ۱/ الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی از شیخ حسین بن محسن یمانی ص ۷۷، دار الاشاعۃ دیوبند ۱۹۳۰ء، نزہۃ الخواطر ص ۳۱۱ و ۱۴/۷، حالات مشائخ نقشبندیہ مجددیہ مولانا محمد حسین نقشبندی، ص ۳۰۴ - ۳۰۳، ناشر ملک فضل الدین ککے زئی لاہور طبع دوم)

[1] مولوی محمد علی (ابن شیخ علی بن شیخ حامد بن شیخ العلماء قاضی محمد صابر متوفی ۱۰۹۶ھ) فاروقی تھانوی قاضی محمد اعلیٰ ہندوستان کے ان جلیل القدر علماء میں سے ہیں، جن پر سرزمین ہند ہمیشہ فخر کرتی رہیگی، کشاف اصطلاحات الفنون قاضی محمد اعلیٰ کی مشہور تالیف ہے، قاضی اعلیٰ اس کی ترتیب سے ۱۱۵۸ھ میں فارغ ہوئے، کشاف اصطلاحات الفنون کا قلمی نسخہ (غالباً نسخہ مؤلف) مولانا ابوالحسن بن مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (متوفی ۱۲۶۹ھ) کے کتب خانہ کی زینت تھا، یہ نسخہ مولانا مملوک علی (متوفی ۱۲۶۷ھ) کے ذریعہ سے ڈاکٹر اسپرنگر کو ۱۸۵۲ء میں ملا، اسپرنگر نے کشاف اصطلاحات کے پیش لفظ میں نسخہ دہلی کا ذکر کیا ہے، اس سے یہی نسخہ مراد ہے، اسکو اسپرنگر نے ولیم ناسولیس کے تعاون سے ایڈٹ کیا، اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے اسے پہلی بار ۱۸۶۲ء میں شائع کیا، دوبارہ پھر سوسائٹی کے زیر اہتمام ۱۹۳۰ء میں طبع ہوئی اس کے بعد آستانہ ترکی سے ۱۳۱۷ھ میں حرف جیم اول تین حصوں میں چھپی، پھر ۱۹۶۳ء میں قاہرہ سے طبع ہوئی، آخری اڈیشن چھ خوبصورت دیدہ زیب جلدوں پر مشتمل ۱۹۶۶ء میں بیروت سے آیا ہے، ان میں سے طبع دوم کلکتہ ترکی اور بیروت کے اڈیشن راقم کی نظر سے گذرے ہیں،

نے اراضی مدد معاش کے سلسلہ میں ایک حکم تحریر فرمایا تھا، مفتی الٰہی بخش[1] کاندھلوی نے یہ حکم

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۱) قاضی محمد اعلیٰ کی تالیف "حاشیہ صدرا" کا قلمی نسخہ بخط مؤلف راقم کے ذخیرہ کتب میں محفوظ ہے،

یوسف سرکیس نے سبق الغایات فی نسق الآیات کو بھی قاضی محمد اعلیٰ کی تالیف میں شمار کرایا ہے (معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ کالم ۴۲۶، ۱/۴ مطبع سرکیس مصر ۱۳۴۶ھ) یہ درست نہیں سرکیس کو علی اور تھانوی کے لفظ سے اشتباہ ہوا، (عام طور پر مورخین محمد اعلیٰ تھانوی کو محمد التھانوی یا علی التھانوی سے ذکر کرتے ہیں) معجم المطبوعات سے یہ غلطی الاعلام خیرالدین زرکلی ص ۱۸۹ - ۱۸۸/۷ (طبع ثالث بیروت) میں نقل ہوئی، اور اب اس غلطی کو درجۂ سند حاصل ہو گیا، حالانکہ سبق الغایات فی نسق الآیات مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۳۶۲ھ) کی تالیف ہے، قاضی محمد اعلیٰ کی طرف اس کی نسبت درست نہیں، دیکھئے فہرست تالیفات اشرفیہ مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۱۲، دلی پریس لکھنؤ ۱۳۵۴ھ، اشرف السوانح خواجہ عزیز الحسن مجذوب ص ۲/۴۶، دلی پریس لکھنؤ ۱۳۵۰ھ، نزہۃ الخواطر ص ۸۵/۸

قاضی محمد اعلیٰ تھانوی نے ۱۱۹۱ھ میں وفات پائی (بیاض قلمی مفتی الٰہی بخش کاندھلوی) قاضی محمد اعلیٰ کا ذکر اکثر کتب حوالہ میں ملتا ہے، مگر عجیب اتفاق ہے کہ قاضی صاحب کے صحیح نام میں اکثر مورخین کو سہو ہوا، صحیح نام اور نسبت، تفصیلی تذکرہ نزہۃ الخواطر میں ۲۷۸/۶ میں ملتا ہے،

[1] مفتی الٰہی بخش (بن نشاط دین بن مولانا حکیم شیخ محمد عرف شیخ الاسلام) صدیقی کاندھلوی ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے، والد محترم سے تعلیم حاصل کی، پھر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور تین سال تک مختلف کتابیں پڑھیں (تذکرہ مفتی الٰہی بخش قلمی مرتبہ مولوی محمد سلیمان کاندھلوی (متوفی ۱۳۲۵ھ) شاہ عبدالقادر (متوفی ۱۲۳۰ھ) شاہ رفیع الدین (متوفی ۱۲۳۳ھ) اور ملک الشعراء برہان الدین منت سونی پتی (المتوفی ۱۲۰۸ھ) کے بھی درس رہے، (نزہۃ الخواطر ص ۲۶۹/۷) (بقیہ حاشیہ ص ۲۷۴ پر)

اظہار خیال کرنے کے لئے قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو بھیجا، قاضی صاحب نے مختصر الفاظ میں مدد معاش کا

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۳) مفتی الٰہی بخش شاہ عبد العزیز کے شاگردوں میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے شاہ فرماتے ہیں:۔

"میرے شاگردوں میں تین آدمی نہایت لائق اور عمدہ ہیں، مولوی رفیع الدین اور مولوی الٰہی بخش جو بقید حیات ہیں، اور کلکتہ میں مولوی مراد علی ہیں، انہوں نے پڑھنے پڑھانے کا شغل چھوڑ دیا ہے، اور تجارت کرتے ہیں (ملفوظات و کمالات عزیزی ص ۵۹ مترجم مفتی انتظام اللہ شہابی طبع پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۰ء)

حضرت شاہ عبد الغنی (بن شاہ ولی اللہ متوفی ۱۲۰۷ھ) سے مسلسل بالاولیہ کی سند حاصل کی، (بیاض قلمی مفتی الٰہی بخش) حضرت شاہ غلام علی (متوفی ۱۲۴۰ھ) اور مولانا سید قطب الہدیٰ والے بریلوی (متوفی ۱۲۲۰ھ) سے صحاح ستہ کی مزدوری قرأت کا شرف حاصل ہے، (فضائل عزیزیہ ص ۴۷) طب میں حکیم علوی خان سے استفادہ کیا۔"

تعلیم مکمل کرنے کے بعد نجیب الدولہ (متوفی ۱۱۸۴ھ، ۱۷۷۰ء) کے دربار سے بحیثیت مفتی اول وابستہ ہوئے اور ضابطہ خاں کی وفات ۱۱۹۹ھ ۱۷۸۵ء تک اسی عہدہ پر فائز رہے، ضابطہ خاں کی وفات کے بعد امیر نگر، بریلی، بھوپال، تھانہ بھون، خورجہ، سہارنپور، کوٹہ (راجستھان) وغیرہ میں درس تدریس اور ملازمت کا سلسلہ رہا، آخر عمر میں وطن آگئے تھے، وطن میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا، مفتی صاحب کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے، مولانا عبد الحئی رائے بریلوی مفتی صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے، ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

درس و افاد مدۃ عمرہ واخذ عنہ | زندگی بھر درس و تدریس میں مشغول رہے
خلق لا یحصون بحد و عد، | اور ان سے بیشمار لوگوں نے استفادہ کیا،

(الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۱۱۱ طبع المجمع العلمی دمشق ۱۳۷۷ھ ۱۹۵۸ء) (بقیہ حاشیہ ص ۲۶۵ پر)

شرعی کا حکم تحریر فرمادیا، مفتی صاحب نے مزید وضاحت چاہی، اس پر قاضی ثناء اللہ صاحب نے دوبارہ اس مسئلہ کے بارہ میں مفصل تحریر لکھدی، یہ دونوں فتوے پہلی بار منظر عام پر آچکے ہیں

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۴) تلامذہ کی طویل فہرست میں مرزا حسن علی (صغیر) محدث لکھنوی متوفی ۱۲۵۵ھ، مولانا سید محمد قلندر محدث جلال آبادی متوفی ۱۲۶۶ھ (ان کے شاگردوں میں محدث جلیل قاری عبد الرحمن پانی پتی متوفی ۱۳۱۴ھ اور سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی متوفی ۱۳۱۷ھ جیسے بلند پایہ حضرات ہیں)، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری متوفی ۱۲۹۷ھ کے نام بھی آتے ہیں،

درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، حدیث، فقہ، تفسیر، تجوید، تاریخ (اور اس کے دوسرے شعبوں تذکرہ و سوانح، رجال و طبقات،) عقائد، کلام، منطق، فلسفہ، نحو، صرف، طب، تصوف، ادب (نظم و نثر عربی اردو فارسی) نجوم، جفر، رمل، عملیات کے متنوع موضوعات پر ساٹھ تالیفات کا ابتک علم ہوا ہے، مولانا احتشام الحسن صاحب نے مشائخ کاندھلہ ص ۱۲۸–۱۲۹ میں صرف ۴۴ تالیفات کا ذکر کیا ہے،

مفتی الٰہی بخش کی تالیفات میں خاتمہ مثنوی مولانا روم مشہور و معروف ہے، اس کی تالیف جناب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ اور مولانا روم متوفی ۶۷۲ھ کے حکم پر ہوئی، ۱۲۱۶ھ میں خاتمہ مثنوی مکمل ہوا، غفور سے تاریخ نکلتی ہے، خاتمہ مثنوی کا پہلا اڈیشن ۱۲۸۲ھ ۱۸۶۶ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے طبع ہوا، اس کے بعد سے آج تک ہر اڈیشن کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی نے حیات امداد ص میں خاتمہ مثنوی کی پہلی طباعت محمود المطابع کانپور مولانا احمد حسن بٹالوی ثم کانپوری کی شائع کردہ بیان کی ہے، یہ درست نہیں،

مفتی صاحب کی وفات بروز یکشنبہ ۱۵ جمادی الآخرہ ۱۲۴۵ھ ۱۳ دسمبر ۱۸۲۹ء بوقت مغرب کاندھلہ میں ہوئی، مولوی کریم الدین نے مفتی صاحب کی وفات ۱۲۵۰ لکھی ہے، یہ بھی صحیح نہیں ہے (بقیہ حاشیہ ص پر)

موجودہ زمانہ میں ان مباحث کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے، لیکن علمی تبرک اور تاریخی دستاویز کے طور پر ان کا مطالعہ مفید ہوگا، چنانچہ اسی نقطۂ نظر سے یہ فتوے پیش خدمت ہیں، ان فتاوے میں سب سے اول الذکر مفتی الٰہی بخش کی قلمی بیاض سے منقول ہے، اسے نقل کرنے کے بعد مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں،

"مولوی محمد ثناء اللہ سلمہ اللہ در سنہ ۱۲۱۲ھ در جواب خط این جانب بمہر خود نوشتہ فرستادہ بودند" کاتبہ الٰہی بخش عفی عنہ،

دوسرے فتویٰ کی اصل قاضی صاحب کی لکھی ہوئی، راقم سطور کے ذخیرہ میں محفوظ ہے،

آخر میں آراضی ہند کے متعلق مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ اور مولانا رشید الدین

(بقیہ حاشیہ صفحہ...) تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو حدیقۃ الافراح احمد بن محمد یمنی شروانی ص ۲۲۵، ۲۲۸، طبع کلکتہ ۱۲۲۹ھ، سفینۂ رحمانی عبد الرحمٰن حیرت جھنجھانوی ص ۷۶، ۷۷، نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۸۰ء، فرائد الدہر مولوی کریم الدین پانی پتی ص ۳۸۶، مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۷ء، تذکرہ مفتی الٰہی بخش قلمی مولفہ مرزا محمد سلیمان کاندھلوی، حالات بر اختتام مثنوی ص ۷، ۸، ۹، محمود المطابع کانپور ۱۳۱۹ھ، نزہۃ الخواطر ص ۷، ۸، مشائخ کاندھلہ طبع اشاعت دینیات دہلی، ص ۵۰ - ۱۱۲)

لہ شاہ محمد اسمٰعیل (بن شاہ عبد الغنی بن شاہ ولی اللہ) فاروقی دہلوی ۱۱۹۳ھ میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا، والد کے انتقال کے بعد شاہ عبد القادر کی تربیت میں آگئے، ابتدائی تعلیم کے بعد اکثر کتابیں شاہ عبد القادر سے اور کچھ شاہ رفیع الدین سے پڑھیں، حدیث کا درس شاہ عبد العزیز سے لیا، ۱۶ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے، مولانا شہید ذکاوت و ذہانت اور قوت حافظہ میں بے مثل تھے، فنون سپہ گری اور تیراکی وغیرہ میں بھی (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۷)

خاں وغیرہ علماے دہلی کے فتوے بھی شامل کر دیئے ہیں، یہ مولانا ابو الحسن صاحب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۶) اپنی نظیر نہ رکھتے تھے مولانا شہید کا نکاح شاہ عبد القادر کی نواسی ام کلثوم سے ہوا، ان سے ایک صاحبزادے محمد عمر تھے جو ۱۲۶۸ھ میں لاولد انتقال کر گئے،

مولانا اسمٰعیل شہید ۱۲۳۴ھ میں حضرت سید احمد شہید متوفی ۱۲۴۶ھ سے بیعت ہوئے اور بیعت کے بعد سید صاحب کے ہو رہے، سید شہید کے ساتھ ہی جمادی الاخری ۱۲۴۲ھ میں اللہ کے لئے راہ ہجرت میں قدم رکھا، اور اس راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دینے کا عہد کیا، بالآخر ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء) کو اس پیمان وفا پر آخری مہر لگا دی، اور سرزمین بالاکوٹ کو اپنے قیمتی خون سے لالہ زار بنا کر فاطر السمٰوات والارض کی بارگاہ میں جا پہنچے،

رد بدعت اور توحید و تصوف میں متعدد مفید اور بیش قیمت کتابیں شاہ اسمٰعیل کی یادگار ہیں، شاہ صاحب شعر و سخن کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے، تعجب کہ ان کے تذکرہ نگاروں نے بہت سرسری ذکر کیا ہے، شاہ صاحب کی ایک نعتیہ مناجات ۹۳ اشعار پر مشتمل اور حضرت سید احمد شہید کی شان میں اسّی شعروں کا طویل قصیدہ مولانا محمد یحییٰ الپھلتی متوفی ۱۳۰۵ھ کا نقل کردہ ۱۲۹۵ھ راقم سطور کی نظر سے گذرا ہے، مولوی محمد جعفر تھانیسری نے سوانح احمدی ص ۱۴۵ طبع بلالی اسٹیم ساڈھورہ میں اس قصیدہ کا ذکر کرتے ہوئے آٹھ شعر نقل کئے ہیں، لیکن ہمارے پیش نظر قصیدہ اور مطبوعہ سوانح احمدی کی ترتیب بہت مختلف ہے، مولانا غلام رسول مہر نے بھی جماعت مجاہدین ص ۱۲۹ (طبع کتاب منزل لاہور) میں اس مناجات اور قصیدہ کا ذکر کیا ہے، مگر مولانا مہر کے خیال میں اس کی نسبت شاہ صاحب کی جانب مشتبہ ہے،

(ملاحظہ ہو ابجد العلوم نواب صدیق حسن خاں ص ۹۱۲، مطبع شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۵ھ، آثار الصنادید سر سید احمد خاں ص ۵۵ - ۵۹، نولکشور لکھنؤ ۱۹۰۰ء، ۱۶ یانع الجنی ص ۷۶، حیات ولی، (بقیہ حاشیہ ص ۲۷۸)

کاندھلوی کی قلمی بیاض سے نقل کئے گئے ہیں، اور ہماری معلومات کی حد تک کہیں طبع نہیں ہوئے ہیں،

(بقیہ حاشیہ ص ۳) مولوی رحیم بخش ص ۴۰-۶۴، ۶۵۳، مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۹۵۵ء (مرزا حیرت دہلوی نے حیاتِ طیبہ کے نام سے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مفصل سوانح حیات لکھی ہے مگر اس کے اکثر مندرجات تاریخی حیثیت سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتے، حیات طیبہ مولانا ابوالکلام آزاد نے دیکھی تو فرمایا، اس میں فرضی کہانیاں لکھی ہیں اور جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ بھی فرضی ہیں، کبھی وجود میں نہیں آئیں، (نسخۂ ذاتی مولانا آزاد) تذکرۂ شہید نمبر ماہنامہ الفرقان بریلی ۱۳۵۵ھ، جماعت المجاہدین مولانا غلام رسول مہر ص ۷۵۱-۷۵۲، کتاب منزل لاہور، سیرت سید احمد شہید مولانا سید ابوالحسن ندوی ص ۵۰۸، ۵۲۴/۲ طبع المعارف ناشران کتب لاہور ۱۹۶۷ء)

۱ مولانا رشید الدین (بن امین الدین بن ... وحید الدین خاں دہلوی نے شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر سے تعلیم پائی، علم کلام اور ہیئت میں خصوصی دسترس حاصل تھی، دہلی کے انگریزی حکام نے عہدۂ قضا کی پیش کش کی، مگر مولانا نے قبول نہیں فرمائی، اور دہلی کالج میں مدرس ہوگئے، مولانا رشید الدین خاں نے ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی، بعض تذکرہ نگاروں نے مولانا کی وفات ۱۲۴۹ھ میں بیان کی ہے جو صحیح نہیں ہے،

(مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۂ فرائد الدہر ص ۴۰۰-۴۰۲، ابجد العلوم ص ۹۱۷، آثار الصنادید ص ۴/۱۵، الیانع الجنی ص ۷۷، نزہۃ الخواطر ص ۱۷۷-۱۷۸/۷،

رد شیعہ میں متعدد رسائل لکھے، جن میں الشوکۃ العمریہ بہت مشہور ہے، کئی شیعہ علماء نے اس کے جوابات لکھے، مثلاً محمد قلی بن محمد حسین کنتوری نے (تشعۃ النغریہ کے نام سے اور محمد بن دلدار علی لکھنوی نے الغرۃ الجلیۃ کے نام سے، اس کے علاوہ بھی مولانا نے کئی تالیفات یادگار چھوڑیں، مولانا کی تالیفات میں سے "اعانۃ المومنین"

مسئلہ اول قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی

سوال بادشاہ اگر زمینے بمستحقے عطا کرد بیع وہبہ وغیرہ تصرفات شرعی در آں جائز باشد یا نہ؟

(سوال) اگر بادشاہ کوئی زمین کسی مستحق شخص کو دے تو کیا اس زمین کو بیچنا اور ہبہ کرنا یا اس میں کوئی اور شرعی تصرف کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۸) دہانۃ الملحدین در رد راجہ رام موہن رائے) مولانا نور الحسن بن مولانا ابوالحسن (متوفی ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء) کاندھلوی کی نقل کردہ ہمارے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے، مولانا کی ایک اور رسالہ عزۃ الراشدین کا قلمی نسخہ بعض خاندانی اعزہ کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے، مولانا رشید الدین کے ایک صاحبزادے مولانا سدید الدین تھے جو دلی کالج میں مدرس بھی رہے، (دیکھئے مرحوم دلی کالج ص ۴۰، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، طبع انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۳ء) افسوس ان کے مفصل حالات کہیں نہیں ملے،

۱ مولانا ابوالحسن حسن (بن مفتی الٰہی بخش صدیقی کاندھلوی) نے اپنے والد بزرگوار سے تعلیم حاصل کی، علم فرائض، اور طب میں امتیازی شان رکھتے تھے، گوشہ نشین اور تارک الدنیا بزرگ تھے، درس و تدریس کا مشغلہ رہتا تھا، شعر و سخن کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، مولانا کا کلام سادہ مگر پرتاثیر ہے، مولانا کی مثنویوں میں محبت خداوندی کو جوش میں لانے کی بڑی صلاحیت ہے، حقائق و معارف میں کئی مثنویاں یادگار ہیں، مولانا حکیم عبدالحیؒ لکھتے ہیں کہ لہ مزدوجات مشہورۃ بالہندیۃ فی الحقائق والمعارف علی نہج المثنوی المعنوی (نزہۃ الخواطر ص ۱۰/۷) ان مثنویوں میں گلزار ابراہیم بہت مشہور ہے، گلزار ابراہیم اور اس کا دفتر اول مثنوی بحر الحقیقت کے نام سے مولف کی حیات میں پہلی بار طبع ہوا، اس کے بعد سے آج تک برابر چھپ رہا ہے، خصوصاً گلزار ابراہیم کو جو قبول عام حاصل ہوا، وہ اردو کی بہت کم کتابوں کے حصہ میں آیا ہوگا، دوسری تالیفات میں مثنوی جد وجہد، مثنوی بجھ بوجھ، ینبوع فیض العلوم اردو ترجمہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۰)

جواب اگر زمین موات کہ کسے مالک آں زمین نباشد، بادشاہ شخصے عطا کرد و معطی لہ آں زمین را احیا نمودہ معطی لہ

جواب اگر افتادہ اور ویران زمین کا کوئی مالک نہ ہو اور بادشاہ اسے کسی کو دیدے اور زمین پانے والا اسے آباد اور قابل انتفاع

(بقیہ حاشیہ ص) مثنوی مولانا روم (یہ بھی ایک بار طبع ہو چکا ہے) منظوم یادگار ہیں، طب میں بحران پر ایک رسالہ اور فرائض میں حل الغوامض کے نام سے ایک ضخیم کتاب تالیف کی،

مولانا نے اپنا کلام بھی مرتب کیا تھا، اردو و فارسی کلام کے مجموعے چند سال پہلے موجود تھے،

مولانا احسن کو حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد سے بڑی دلچسپی اور گہری وابستگی تھی، مولانا نے سید صاحب کی شان میں متعدد قصیدے کہے، اور ایک رسالہ جہادیہ لکھا، مولانا نے سید صاحب کی حج سے واپسی پر ایک طویل قصیدہ پیش کیا تھا، اس کے کچھ اشعار مولوی محمد جعفر تھانیسری نے سوانح احمدی ص ۶۶-۶۹ طبع ہلالی پریس ساڈھورہ) میں اور مولانا غلام رسول مہر نے سید احمد شہید ص ۲۴۲-۲۴۳ (ادول کتاب منزل لاہور) میں نقل کئے ہیں، مولانا احسن کی بیاض میں مکمل قصیدہ خود مولانا کا تحریر کردہ موجود ہے،

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے گلشن بیخار میں سعادت خاں ناصر نے خوش معرکۂ زیبا میں اور شیر محمد خاں سرور نے عمدۂ منتخبہ میں مولانا احسن کا ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ متعدد تذکرہ نگاروں نے یہاں ان کا ذکر ملتا ہے،

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی متوفی ۱۳۱۷ھ مولانا ہدایت اللہ فارسی سورتی متوفی ۱۳۲۵ھ اور شاہ عنایت علی صابری جیسے علما آپکے شاگردوں میں ہیں،

۱۳ جمادی الاخریٰ ۱۲۷۰ھ ۱۲ مارچ ۱۸۵۳ء بروز چہارشنبہ کاندھلہ میں وفات پائی (حالات کیلئے دیکھئے سفینۂ رحمانی قلمی تذکرہ مفتی الٰہی بخش مشمولہ خاتم مثنوی قلمی، نزہۃ الخواطر ص ۱۰، اور مشائخ کاندھلہ ص ۱۳۴-۱۴۴)،

مالک رقبہ آں زمین می شود، بعد مردن معطی لہ بورثہ او می رسد و بیع وغیرہ تصرفات در رقبۂ آں زمین جاری می شود و عشر یا خراج آں زمین از معطی لہ بادشاہ گیرد و در مصرف آں خرچ کند و اگر معطی لہ مصرف عشر یا خراج باشد جائز ست کہ بادشاہ عشر و خراج آں زمین بمعطی لہ ببخشد و ہر گاہ خود از معطی لہ موقوف کردہ بدیگر بدہد، و اگر زمینے است مزروعہ در بیت المال و بادشاہ آں زمین را بشخصے مستحق بانعام بدہد معطی لہ مالک رقبۂ آں زمین می شود و حکم خراج آں زمین ہمین است کہ بالا گذشت، و اگر محصول آں زمین برائے کسے بطریق عاریت تحریر کرد، آں کس مالک آں زمین نمی شود، و بیع و ہبہ دراں جائز نیست و اگر زمینے است مملوک دہقاناں و خراج آں زمین را بادشاہ در وجہ مدد معاش

بنا دے، تو یہ شخص اس زمین کا مالک ہو جائیگا اس کے مرنے کے بعد وہ زمین اسکے وارثوں کو ملیگی اور اس میں بیع وغیرہ ہر قسم کے تصرفات ہو سکتے ہیں، اس زمین کا عشر یا خراج لیکر بادشاہ ان کے مصارف میں خرچ کریگا اور اگر زمین والا خود عشر یا خراج کا مستحق ہو تو بادشاہ کیلئے اس زمین کا عشر یا خراج اسے دیدینا جائز ہے، لیکن اگر وہ شخص خود لینے سے باز رہے تو بادشاہ دوسرے کو دے سکتا ہے، اور اگر بیت المال کی کاشت کے لائق کوئی زمین ہو اور بادشاہ اسے کسی مستحق آدمی کو ہمیشہ کیلئے بطور انعام دیدے تو یہ شخص زمین کا مالک ہو جائیگا اور اس کے خراج کا بھی وہی حکم ہوگا جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے، لیکن اگر محض زمین کی پیداوار کسی شخص کے لئے بادشاہ نے عاریۃً تحریر کی ہو تو وہ شخص نہ اسکا مالک ہوگا اور نہ ایسی زمین کی بیع و ہبہ جائز ہے، اور اگر کوئی زمین کاشتکاروں کی ملکیت میں ہو اور اس کا خراج بادشاہ کسی مستحق شخص

بکسے از ارباب استحقاق عطا کرد،
عطائے مؤبد، غیر مؤبد چنانچہ رسم بادشاہان
ہندوستان بیع و ہبہ وغیرہ تصرفات در آں
جائز است، چرا کہ خراج حقے است
از حقوق ... عہ شے موجود نیست لہذا
معطی لہ بعد قبض کردن غلہ خراج مالک
غلہ می شود و پیش از قبض مالک نمی شود
پس بیع و ہبہ تصرفات شرعی در مدد
معاش جائز نیست و بعد فوت
معطی لہ در وارث نہ آید در اختیار
بادشاہ است یا نائب او کہ صدر است

روایات مختلفہ کہ در کتب فقہ در حق
عطائے سلطانی مرقوم است در ضعیف
روایات محکمہ نیست بلکہ باعتبار اختلاف
اقسام زمین است، محل جواز بیع

کو گذر بسر کیلئے بطور امداد مستقل طور
یا غیر مستقل طور پر دیے، جیسا کہ ہندوستان
کے بادشاہوں کا دستور ہے تو ایسی
زمین میں بیع و ہبہ وغیرہ ہر طرح کے
تصرفات جائز ہیں، کیونکہ خراج کی
حیثیت ایک شرعی حق کی ہے، .....
اس لئے جس کو خراج گذر بسر کے لئے دیا
گیا ہو وہ خراج پر قابض ہونے کے بعد پیداوار کا
مالک ہوگا، قبضہ سے پہلے مالک نہ ہوگا پس جو
گذر بسر کیلئے بطور مدد دی گئی ہو اسمیں بیع و ہبہ
یا اور کوئی شرعی تصرف جائز نہیں ہے اور نہ
مرنے کے بعد اس میں وراثت جاری ہوگی
بلکہ یہ بادشاہ یا اس کے قائم مقام شخص
کے جو صدر ہوگا، اختیار میں رہیگی،
عطائے سلطانی کے متعلق فقہی کتابوں میں
جو روایتیں درج ہیں، ان میں ضعف کا
احتمال نہیں ہے، بلکہ ان میں احتمالات
دراصل زمین کی قسموں کے اختلاف کی وجہ

عہ یہ لفظ واضح نہ ہو سکا،

وغیرہ تصرفات دیگر است و محل
عدم جواز دیگر،
دریں بلدہ پانی پت کہ بیع مدد معاش
رواج دارد ایں بیع رواجی عرفی
است موافق قاعدہ شرع نیست،
مگر بیع رقبہ زمین کہ مالک قسمی کند
شرعاً جائز و نافذ است
واللہ اعلم،

پائے جاتے ہیں بیع وغیرہ تصرفات کے جواز کا
محل اور ہے اور عدم جواز کا اور،
اس شہر پانی پت میں مدد معاش کے لئے
دی جانی والی چیزوں کی بیع کا جو رواج
ہے وہ شرعی قاعدے کے موافق نہیں ہے بلکہ
عرفی اور رواجی قاعدہ کے مطابق ہوا ہے
رقبہ زمین کا مالک جو بیع کریگا وہ شرعاً
جائز اور نافذ ہوگی، واللہ اعلم،

(۳)

مکتوب گرامی قاضی ثناء اللہ پانی پتی بنام مفتی الٰہی بخش کاندھلوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم
مولوی صاحب شفیق مہربان من سلامت!
بعد از سلام سنت الاسلام واضح
رائے گرامی باد سابق خط سامی
معہ سوال فتویٰ و حکمنامہ مہری
قاضی محمد اعلیٰ در بارہ حکم قاضی بر طبق
دستور العمل بادشاہی در باب
مدد معاش رسیدہ بود و جواب آں
خط مع جواب آں مسئلہ ہماں

بسم اللہ الرحمن الرحیم
میرے شفیق و مہربان مولوی صاحب!
سلام مسنون کے بعد معلوم ہو کہ آپ کا
پہلا خط مع استفتا ملا تھا، اس کے
ساتھ قاضی محمد اعلیٰ کی مہر لگا ہوا وہ
حکمنامہ بھی تھا جو مدد معاش کے بارہ میں
بادشاہ کے دستور العمل کی مطابقت پر
قاضی کے حکم کے بارہ میں تھا اس خط اور
استفتا کا جواب خط لانے والے کو تحریر

دار ندہ خط نوشتہ فرستادہ بودم
ظاہراً آں خط نزد آں مہربان نہ
رسیدہ، عبارت آں سوال وحکم
قاضی محمد اعلیٰ مفصل یاد نیست لیکن
فتویٰ ایں باب نوشتہ می شود کہ
زمین ہائے ہندوستان مثل ارضی
سواد عراق مملوک بادشاہ اسلام نیست
ونہ مملوک مسلمانان بلکہ مملوک اہل آں زمین
ہست اگرچہ کفار باشند قال
فی الہدایہ،
ارض السواد مملوکۃ لاہلہا یجوز
بیعہم لہا وتصرفہم فیہا لان الامام
اذا فتح ارضا عنوۃ وقہرا لہ ان
یقر اہلہا علیہا ویضع علیہا الخراج
فتبقی الارض مملوکۃ لاہلہا،
وخراج حقے است اسلامی تعلق
بزمین دارد، بادشاہ متولی اخذ
آں خراج است وصرف آں در
مخرج، اگر در غیر مصرف خرچ کند

کرکے بھیج چکا ہوں، مگر غالباً وہ جناب
کو نہیں ملا، سوال کی عبارت اور قاضی
محمد اعلیٰ کے فتوی کی تفصیل تو یاد نہیں
رہی، تاہم اس بارہ میں فتوی تحریر
کیا جاتا ہے،
سواد عراق کی زمینوں کی طرح ہندوستان
کی زمینیں بھی نہ مسلمان بادشاہ کی
ملکیت ہیں، اور نہ مسلمانوں کی، بلکہ ان کے
مالک زمین والے ہی ہونگے خواہ یہ کافر
ہی کیوں نہ ہوں، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں
سواد کی زمین زمین والوں کی ملکیت میں ہوگی
ان لوگوں کو اسے بیچنے اور اس میں تصرف
کرنے کا حق حاصل رہیگا کیونکہ جب امام کسی
زمین کو زبردستی فتح کرے تو وہ اس پر زمین
والے کے قبضہ کو برقرار رکھے گا اور
اس پر خراج عاید کریگا، اس طرح زمین
پہلے کی طرح اپنے مالک کی ملکیت
تصرف میں رہیگی، زمین پر خراج
ایک اسلامی حق ہے، بادشاہ اسکو

عاصی باشد قال فی فتاوی الرحمانی
الامام کما یجوز الامساک عن المصرف
فکذا لا یجوز الصرف فی غیر المصرف

وخراج امرے است معدوم
تملیک آں ممکن نیست،
بادشاہاں کہ مدد معاش باہل
استحقاق می دہند حاصلش آنست
کہ ہرگاہ کہ خراج آں زمین
بدست آید آں مستحق آں خراج
را بگیرد وبعد قبض آں را
مالک شود قال فی فتاوی الرحمانی
اختلف العلماء فی حکم الوظیفۃ التی
یعطیہا الامام لبعض المستحقین من
خراج الارض وغیرہ، ہل یملکہ
المعطی لہ قبل القبض فعند الجمہور
لا یملکہ قبل القبض ویملکہ عند البعض

لینے اور اسے اسکے مصرف میں خرچ کرنیکا مجاز
ہوتا ہے اگر وہ بیجا مصرف میں خرچ کریگا تو گنہگار
ہوگا چنانچہ فتاوی رحمانی میں ہے کہ جس طرح
خرچ سے رکنا امام کیلئے جائز نہیں ہے
اسی طرح بیجا مصرف میں خرچ کرنا بھی
جائز نہیں ہے،
دراصل خراج ایک ایسی معدوم چیز
ہے، جس کی تملیک جائز نہیں،
بادشاہ مستحقین کو گذر بسر کے لئے
جو کچھ دیتے ہیں اسکا حاصل یہ ہے کہ جب
بھی اس زمین کا خراج حاصل ہوگا تو مستحق
اس کو لے گا اور قبضہ کے بعد اسکا مالک
ہو جائیگا، فتاوی رحمانی
میں ہے:۔
بادشاہ بعض مستحقین کو زمین کے خراج وغیرہ
کی صورت میں جو انعام دیتا ہے اسکے حکم میں
میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا قبضہ سے
پہلے ہی وہ شخص اس کا مالک ہو جائیگا
جسے انعام ملا ہے یا بعد میں؟ جمہور کے نزدیک

قول الجمہور ہو موافق لقوانین
الفقہیہ فان الاصل ان المعدوم
لا یصح تملیکہ ولا یصح من التصرفات
فیہ ولہذا معطی لہ فروختن حق خراج
زمین جائز نیست وہم در ارث
نمی آید فال فی الفتاوی الاحمدیہ
وغیرہا،

قبضہ سے پہلے مالک نہیں ہونگے، اور بعض
لوگوں کے نزدیک ہو جائیگا، جمہور کا مسلک
فقہی ضابطوں کے موافق ہے، کیونکہ اصول
یہ ہے کہ معدوم کا مالک بنانا، اور اس میں
تصرفات کرنا صحیح نہیں ہے، اسی بناء پر
انعام پانے والے شخص کے لئے زمین کے
خراج کو فروخت کرنے کا حق نہیں ہے
اور اس کے اندر وراثت بھی نہیں ہوگی،

فتاوٰی احمدیہ وغیرہ میں ہے کہ:

الاراضی التی اعطاہا الامام رجلا
علی وجہ الادرار والاستحقاق لا
یصیر ملکا لہ فلا تباع ولا توہب ولا
تورث ولہذا یوضع الخراج فی
بیت المال عند موت المعطی لہ
فی مفوضۃ الی رائے الامام
او نائبہ وکذا فی تاتار خانیہ والمحیط
پس بعد موت معطی لہ بادشاہ
وقت اگر خواہد ومستحق داند
بورثہ او تجویز کند واگر خواہد بکسے

جن زمینوں کو امام استحقاق کے طور پر کسی
شخص کو دیتا ہے تو یہ شخص ان زمینوں کا
مالک نہیں ہوتا ہے، اس وجہ سے نہ ان کو
بیچا اور نہ ہبہ کیا جائیگا اور نہ ان میں
وراثت چلے گی، بلکہ عطا کئے جانے والے
کی وفات کے بعد خراج بیت المال
میں داخل کیا جائیگا، فتاوٰی تاتار خانیہ
اور محیط میں بھی یہ مسئلہ اسی طرح بیان ہوا ہے
پس اس کے مرنے کے بعد اگر بادشاہ
وقت مستحق سمجھے گا، تو اس کے ورثہ کے لئے

دیگر بدہد واگر خواہد در بیت المال
جمع دارد، لیکن ایں حکم بہ بادشاہ
حال تعلق دارد وبعد از اں کہ بادشاہ
بمیرد یا معزول شود حکم او معتبر نیست
از بسکہ بادشاہان دہلی
بلدہ خود نمی توانستند رسید لہذا عہدہ
جز مقرر کردہ بودند ودستور العمل
نوشتہ دادہ بودند کہ موافق ایں
دستور العمل در دیارشان معطی
لہ آراضی مدد معاش را تقسیم
می کردہ باشند، آں دستور العمل
تا وقت حیات ایں بادشاہ
جاری ومعتبر است، صدور
بر آں عمل کنند، وقاضیان ہم حکم
صدور را کہ نائب بادشاہ جاری
دارند، لیکن بعد موت آں
بادشاہ آں دستور العمل معتبر
نیست،
وآنچہ قاضی اعلیٰ نوشتہ اند کہ دستور العمل

اسے تجویز کر دیگا، اور اگر چاہے گا تو
دوسرے شخص کو دیدیگا، اور اگر چاہیگا
تو بیت المال ہی میں محفوظ رکھے گا
لیکن یہ واضح رہے کہ یہ حکم موجودہ
بادشاہ سے متعلق ہے، کیونکہ اگر بادشاہ
کا انتقال ہو جائے یا وہ معزول کر دیا
جائے تو اس کا حکم معتبر نہ ہوگا، خلاصہ کلام
یہ ہے کہ بادشاہ اپنی سلطنت کے تمام
شہروں میں نہیں پہنچ سکتے تھے اس لئے
وہ صدور کو مقرر کرتے، اور اپنا
دستور العمل تحریر کرتے تھے، اسی کے
مطابق انعام پانے والے کے ورثہ
معاشی مدد کے لئے دی جانے والی زمینوں
کو تقسیم کرتے ہیں، یہ دستور العمل بادشاہ
کی زندگی تک جاری و معتبر سمجھا جاتا ہے،
صدور اسی پر عمل کرتے ہیں اور قضاۃ بھی صدور
کے حکم کو جاری کرتے ہیں کیونکہ وہ بادشاہ کے نائب
ہوتے ہیں، لیکن بادشاہ کی موت کے بعد وہ دستور العمل معتبر نہیں رہ جاتا
باقی قاضی اعلیٰ نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ

شاہجہانی منسوخ گشتہ و دستورالعمل
عالمگیری معتبر ماندہ، ایں سخن
اصلی ندارد و در فہمید ما نمی آید
معتبر تجویز بادشاہ حال است،
اگر در زمانہ بادشاہ حال مسلط
نباشد دراں صورت مدد معاش
ہائے ایں دیار دو قسم اند،
یکے آنست کہ زمینداران از
قسم گوجر و جاٹ و مانند آں
براں قابض اند چنانچہ در دیہات
وملکے و خراج آں زمین از
زمیندار بگیرند، ایں قسم خراج
بیع و جہ در بیع نمی تواند آید مگر
مگر آنکہ بطریق عرف آنچہ میگیرند
میگیرند،
و قسم دیگر مدد معاش آنست
کہ در اکثر قصبات است کہ زمیندار
سوائے ملکیاں کسے دیگر نیست
و ہماں ملکے زمیندار است دریں

شاہجہانی دستورالعمل منسوخ ہوگیا ہے اور
عالمگیری دستورالعمل معتبر ہے، تو اسکی کوئی بنیاد
نہیں اور یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی موجودہ
بادشاہ کی تجویز کا اعتبار ہوتا ہے، اگر کسی
زمانہ میں بادشاہ کا تسلط باقی نہ ہو تو ایسی
صورت میں اس علاقہ کی گذر بسر کیلئے دیجانیوالی
امدادی زمینوں کی دو قسمیں ہیں،
پہلی قسم ان زمینوں کی ہے، جن پر گوجر جاٹ
یا اور قوموں کے زمیندار قابض ہوتے ہیں
دیہات اور دوسرے علاقوں میں
ان زمینوں کا خراج زمیندار سے لیا
جاتا ہے، اور اس طرح کے خراج کو
کسی صورت میں فروخت نہیں کیا جاسکتا
ہے، بجز اس کے کہ لوگ رواج کے مطابق
جو کچھ حاصل کریں، کریں،
معاشی امداد کے لئے دیجانی والی زمینوں
کی دوسری قسم میں اکثر قصبات کی وہ
زمینیں ہیں جن کے مالک زمیندار کے سوا
اور کوئی نہیں ہوتا ایسی صورت میں اگر

صورت اگر آں ملکے زمین خود را
بفروشد بحکم زمینداری بیع او
جائز است و ہم وراثت می آید
و موافق فرائض اللہ تقسیم کردہ
بدہد، و خراج ایں زمین چوں کسے
بادشاہ مسلط نباشد ہماں مشتری
می خوردہ باشد کہ حق اخذ خراج
مر بادشاہاں راست یا کسے کہ
بادشاہ حال بوے تجویز کردہ
بدہد، دریں صورت کسے را
دعوی مزاحمت نمی رسد
در عہد محمد شاہ بادشاہ چوں
بادشاہ حال دستورالعمل عالمگیری
را مسلم داشتہ باشد آں دستورالعمل
ہم بادشاہ حال شدہ واگر
خلاف دستورالعمل ہم بادشاہ
تجویز کردہ بدہد آں تجویز ہم جائز
باشد غرضیکہ ایں امر بابت خراج
کسے را دیگرے بدوں حکم جدید

مالک اپنی زمین کو فروخت کرے تو اسکی
بیع زمینداری کے قاعدہ سے جائز ہوگی
اور اس میں وراثت بھی جاری ہوگی
اور اللہ کے مقرر کردہ قاعدہ کے مطابق
ان کی تقسیم بھی ہوگی، اگر کوئی بادشاہ
نہ ہو تو ایسی زمین کا خراج خود خریدنے
والا کھائیگا، اور اس میں کوئی شخص مزاحمت
نہیں کرسکتا، کیونکہ خراج لینے کا حق
صرف بادشاہ کو ہے یا ایسے شخص
کو جس کو موجودہ بادشاہ نے
تجویز کیا ہو،
سلطان محمد شاہ نے اپنے دور میں عالمگیری
دستورالعمل کو باقی رکھا تھا، اس لئے اسی
کو موجودہ دستورالعمل سمجھا جائیگا اور
اگر موجودہ بادشاہ اس کے مخالف
دستورالعمل کو تجویز کرے تو یہ بھی جائز
ہوگا، غرضیکہ خراج کے معاملہ میں موجودہ
بادشاہ کے حکم کے بغیر محکمہ قضا میں کسی
شخص کا دوسرے شخص پر دعوی نہیں

بادشاہ حال در محکمۂ قضا دعوی مسموع
نیست، دریں ایام احوال بادشاہ
معلوم است و صدر جز از مدتے
در پرگنات نیست کہ در تجویز مدد
معاش او را نائب بادشاہ گفتہ شود
اگر کسے نزد صدر الصدور می رود
صدر الصدور را نہ ملاحظہ دستور العمل
است، نہ ملاحظہ اجازت بادشاہ
نہ دریافت استحقاق ہر کس کہ رود
دو روپیہ می دہد او را نوشتہ می دہد
اگر طرف ثانی می رود او ہم دو
روپیہ گرفتہ نوشتہ می دہد، نوشتہ
او را چہ اعتبار،

وقاضیاں حاکمان شرع اگر حکم
کنند موافق شرع حکم کنند و اگر
تجویز صدر جز یا تجویز بادشاہ مستحق
باشد قاضی آں تجویز را جاری نمایند

سنا جائیگا، اس زمانہ میں بادشاہ کے
حالات معلوم ہیں اور مدت سے پرگنوں
میں ایسے صدر بھی نہیں رہے، جو
معاشی امداد کی تجویز میں بادشاہ کے
نائب کہلائے جا سکیں،
اگر کوئی صدر الصدور کے پاس جاتا
ہے تو اس کا حال یہ ہے کہ اس نے
نہ دستور العمل کو دیکھا ہے اور نہ اسے
بادشاہ ہی کی اجازت حاصل ہے، اور
نہ وہ یہ جانتا ہے کہ کس کا کیا حق ہے جو
شخص اس کے پاس جاتا ہے دو روپے
دیتا ہے، اور اس کے لئے فرمان جاری
ہو جاتا ہے اگر فریق مخالف بھی جائے
تو دو روپیہ لیکر اس کو بھی نوشتہ دیدیا
جاتا ہے، ظاہر ہے ایسے نوشتہ کا کیا اعتبار ہے
قاضیوں کی حیثیت شرعی حکام کی
ہے، وہ اگر فیصلہ کرتے ہیں تو شرع کے
مطابق کرتے ہیں، اگر صدر یا بادشاہ
کی تجویز سے کوئی شخص مستحق قرار پاتا

ایں ہم گنجائش دارد، کہ ایں ہم
حکم شرع است و اگرنہ خود قاضی
را اذن دستور العمل یا خلاف دستور العمل
تجویز کردن و حکم نمودن نمی رسد
کہ قاضیان دریں مادہ نائب
بادشاہ نیستند،

تمّ بحمد اللہ
۱۲۱۱

ہے تو قاضی اس تجویز کو جاری کر سکتا
ہے، اس کیلئے صرف اسی قدر گنجائش ہے
باقی قاضی کو دستور العمل کے موافق
یا مخالف کوئی چیز تجویز کرنے اور حکم جاری
کرنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ قاضی بادشاہ
کے نائب نہیں ہوتے،

(۳)

فتویٰ مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید و مولانا رشید الدین خان و غیرہ علمائے دہلی

لو اعطی الامام لفقیر مستحق شیئاً
من الارض المیتة فاحیاہ
باذنه هل یصیر ملکاً له ام لا؟

الجواب: قال نعم وکذا لو اعطی الامام
لفقیر مستحق شیئاً من الارض
النامیة یصیر الفقیر مالکاً له
لانه بمنزلة التصدق والفقیر
یملک التصدق باستحقاقه
کذا هذا، ولو باع الفقیر هذا

اگر امام کسی مستحق اور ضرورت مند شخص کو مردہ
زمین میں سے کچھ دیدے اور وہ امام کی اجازت سے
اسکو آباد کردے تو کیا یہ شخص اس زمین
کا مالک ہوگا یا نہیں؟
اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں وہ مالک ہو جائیگا
اسی طرح اگر امام کسی محتاج مستحق کو کوئی
آباد اور نفع بخش زمین دے، تو محتاج اسکا
مالک ہو جائیگا کیونکہ اسکی حیثیت صدقہ
کی ہوگی اور ضرورتمند اپنے استحقاق کی
وجہ سے صدقہ کا مالک ہو جائیگا اور اگر

هذا الارض جاز بيعه وشرائه لانه يملكه وهو الصحيح وذكر في الكبرى اذا اعطى السلطان ارضا لرجل استحقاقاً لا يصير تملك الارض ملكا له ولا يجوز بيعها الا ترى انه اذا مات ذالك الرجل يوضع خراج الارض المذكور في بيت المال وهكذا اختاره صاحب الذخيرة لكن الفتوى في زماننا على الرواية الاولى لان العرف شاهد لها والفتوى يتغير بتغير الزمان من فتوى مختصر شاهي۔

محتاج نے یہ زمین بیچ دی تو اس کی خرید و فروخت جائز ہے، کیونکہ وہ اس کا مالک ہے، یہی صحیح فتویٰ ہے، مگر کبریٰ میں مذکور ہے کہ جب بادشاہ کسی شخص کو استحقاق کی وجہ سے کوئی زمین دے تو وہ اس زمین کا مالک نہ ہوگا اور نہ اس کی بیع جائز ہوگی، کیونکہ جب یہ شخص فوت ہو جائیگا تو مذکورہ زمین کا خراج بیت المال میں داخل کیا جائیگا، صاحب ذخیرہ کا مختار قول یہی ہے، لیکن ہمارے زمانہ میں فتویٰ پہلی روایت پر ہے، کیونکہ وہ رواج کے مطابق ہے اور زمانہ کے تغیر سے فتوے بھی بدل جاتے ہیں، (دیکھو فتوی مختصر شاہی)

جامع مسجد برہان پور کے کتبات

فتح اسیر گڈھ کا کتبہ

از

جناب مولوی معین الدین صاحب استاذ اردو و فارسی سیوا سدن کالج برہان پور

(۲)

شہنشاہ اکبر کے ۱۰۰۸ھ میں برہان پور پہنچنے کا ایک تاریخی ثبوت یہ بھی ہے کہ مستند تاریخی کتابوں کی صراحت کے مطابق حضرت سید احمد گیسو دراز کے پوتے حضرت سیدی صاحب اکبر کے طبیب خاص حکیم مصری، خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کی والدہ ماہم انگہ (جو شہنشاہ اکبر کی رضاعی والدہ تھی) سندھ کے معزول بادشاہ مرزا جانی اور جون پور کے نواب بابا بیگ جلایر کی وفات ۱۰۰۸ھ میں اسیر گڈھ کے دوران محاصرہ میں ہوئی تھی۔ ان میں سے سیدی صاحب بہادر شاہ کی فوج میں ملازم اور قلعۂ اسیر میں محصور تھے، باقی کے چاروں اکبر کے ساتھ برہان پور آئے تھے، چونکہ اسیر گڈھ کا محاصرہ اکبر کے برہان پور پہنچنے کے بعد ہوا تھا، اس لئے اکبر کے ورود برہان پور کا ۱۰۰۸ھ ہی تھا نہ کہ ۱۰۰۹ھ، مینار کے اس کتبہ میں اکبر کے ورود برہان پور کی صحیح تاریخ پڑھنے میں اکثر حضرات کو دھوکا ہوا کتبہ میں فروردین کی تاریخ کا ۲۱ کا ہندسہ کسی قدر محو ہو گیا ہے، جسے اکثر حضرات نے ۱۱ پڑھا ہے، حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو کتبہ میں بائیں جانب کا ہندسہ ۲ صاف نظر آتا ہے، جس سے ابوالفضل

کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ شہنشاہ اکبر ۲ فروردین کو وارد برہان پور ہوا تھا اسی طرح کتبہ میں رمضان کی تاریخ درج نہیں ہے لیکن پڑھنے والوں نے اسے ۵ رمضان پڑھا ہے، اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہوئی کہ کتبہ میں رمضان کی "ر" کا کچھ حصہ مٹا ہوا سا ہے، اس لئے اکثر حضرات نے اسے ۵ کا مٹا ہوا ہندسہ سمجھ کر اکبر کے ورود برہان پور کی تاریخ ۵ رمضان قرار دی ہے، جو غلط ہے، کیونکہ اگر اسے ۵ مانیں تو پھر رمضان کی "ر" کہاں ہے،؟

اب رہا اکبر کی آمد کا ہجری سنہ تو اگر کتبہ کی تحریر کے مطابق ۱۰۰۹ کو صحیح مانا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسیر گڈھ ایک ہی مہینہ میں فتح ہو گیا تھا، کیونکہ کتبہ کے مضمون اور انداز بیان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ماہ رمضان المبارک ہی میں شہنشاہ اکبر کی آمد تھی، برہان پور کا بادشاہ بہادر خان فاروقی عید کے چاند کی طرح اس کا انتظار کر رہا تھا، جب شہنشاہ ۲۴ رمضان المبارک ۱۰۰۹ھ میں برہان پور پہنچا تو بہادر خاں نے جھٹ آکر قدم بوسی کی عزت حاصل کی اور بکمال عقیدت اسیر گڈھ نذر کر دیا، جسے شہنشاہ نے فتح اسیر سے تعبیر کیا، یہ معاملہ ہنسی خوشی انجام پا گیا، نہ کوئی جنگ ہوئی نہ کسی قسم کی مزاحمت، چند روز عید کی ملاقاتوں میں گزار کر شہنشاہ اکبر ۲۶ شوال ۱۰۰۹ھ میں لاہور چلا گیا، اس طرح یہ سب کارروائی بخیر و خوبی ایک مہینہ میں انجام پا گئی، حالانکہ تاریخی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً گیارہ ماہ تک اسیر گڈھ کا محاصرہ رہا اور اس دوران میں سخت جنگ بھی ہوتی رہی، قلعہ سے گولے برستے رہے، اور قلعہ کے باہر راجپوتوں اور کولیوں کے چھاپہ مار دستے مغل فوج کا ناک میں دم کرتے رہے، اس طویل عرصہ میں اکبر کے بے شمار سپاہی قتل ہوئے، اور بے حساب سامان لوٹا گیا، ظفر الوالہ کے الفاظ میں اس جنگ کا حال سنئے،

والعساکر تخرج من الباب	(بہادر شاہ فاروقی کی) فوجیں
و تحارب المغل و ترجع	(قلعہ کے) دروازہ سے نکل کر جنگ
البنادق والمدافع من ابراج	کرتیں، اور واپس آتی تھیں تینوں
الحصار الاول والثانی و	حصاروں[1] کے برجوں سے بندوقیں
الثالث لا تزال تطعن	اور توپیں (دشمنوں کو) مسلسل
الی ان ھلک جم غفیر	نشانہ بناتی رہتی تھیں، یہاں تک کہ
من النازلین علی القلعۃ	حملہ آور فوج کا جم غفیر ہلاک ہو گیا
مع الامیر الکبیر میرزا	حملہ آوروں میں امیر کبیر مرزا خرم بھی
خرم ابن الخان الاعظم	شامل تھا جو خان اعظم مرزا عزیز
عزیز کوکلتاش بن	کوکلتاش کا فرزند اور شمس الدین
شمس الدین محمد اتکہ	محمد اتکہ خاں کا پوتا تھا، اگرچہ
خان مع ان عسکر	(بہادر شاہ فاروقی کی) میدانی
السھل لحق بالمغل	فوج مغلوں کی اطاعت کرکے
انقطعت الطرق و	ان سے مل گئی تھی، (اس لئے اس
ذلک لانہ سکنۃ الارض	سے مغلوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا)
من الراجبوت وھم اھل	پھر بھی راستے مخدوش ہو گئے تھے،
الجبل فیھا والکولی وھم	کیونکہ مقامی باشندوں میں سے

[1] قلعہ اسیر میں تین حصار ہیں، پہلا کوہ اسیر کی زیریں بلندی پر ہے، دوسرا درمیانی بلندی پر اور تیسرا انتہائی بلندی پر، یہ بالترتیب مالی گڈھ، کمر گڈھ اور اسیر گڈھ کے حصار کہلاتے ہیں،

رجل اجتمعوا علی القتل	راجپوت سواروں اور کولھی پیادوں
والسلب، فهلک بهم من	نے متفق ہوکر (مغلوں کو) قتل و
خیل السلطنة ورجلها و	غارت کرنا شروع کر دیا تھا، اس
اتباعها والمتوجهة الیها	لئے شہنشاہ اکبر کے سوار، پیادے
من سائر الاصناف ما	نوکر چاکر، اور اس کی طرف آنے
لا یحصی کثرة ۔ وتموّل	والے ہر قسم کے لوگ اس کثرت سے
سکنة الارض وملکوا من	ہلاک ہوئے کہ ان کا شمار ناممکن ہے،
الخیل والجمال والامتعة	مقامی باشندے یعنی راجپوت اور کولھی
والاثاث والاسباب	(لوٹ کے مال سے) مالا مال ہوگئے
ما صار لهم شان وریاسة	اور ان کے قبضہ میں اتنے اونٹ
	گھوڑے اور دیگر سامان و اسباب
	آیا کہ وہ صاحب حیثیت رئیس بن گئے

جب شہنشاہ اکبر اپنی پوری طاقت لگانے کے باوجود ناکام رہا تو اس نے دھوکہ سے قلعہ پر قبضہ کرنا چاہا، چنانچہ اس نے بہادر شاہ فاروقی کو اس کی سلطنت پر قائم رکھنے کی ضمانت دیکر ملنے کے لئے بلایا، بہادر شاہ اسے ایک سیاسی چال سمجھ کر قلعہ سے اترنے پر راضی نہیں ہوا، ادھر قلعہ میں غلہ سڑ گیا تھا، اور بیضہ پھوٹ پڑا تھا جس کی وجہ سے اہل قلعہ پریشان تھے، اور مصالحت کے ذریعہ اکبری حملہ کی مصیبت سے نجات پانا چاہتے تھے۔ اس لئے عرب سردار مجاہد یا نبی نے بہادر شاہ سے کہا کہ جب شہنشاہ ہند آپ کو سلطنت پر قائم رکھنے کا وعدہ کر کے ملنے کے لئے بلا رہا ہے، تو آپ کو اس سے ملنے میں کیا عذر ہے، اگر آپ قلعہ سے اتر کر اس کے

پاس نہیں گئے تو ہم آپ کو (زبردستی) اتار کر اس کے پاس لیجائیں گے، ظفرالوالہ کے الفاظ یہ ہیں، قال لبهادر ما یمنعک من الاجتماع بسلطان الهند وهو یعدک بابقاءک فی الملک۔ وان لم تنزل الیه نزلنا بک الیه"

آخر کار طویل بحث و مباحثہ کے بعد بہادر شاہ کا معتبر امیر سادات خاں شاہی اجازت لے کر شہنشاہ اکبر سے عہد و پیمان لینے کے لئے قلعہ سے اترا، لیکن اس نے اپنے آقا سے غداری کی اور شہنشاہ سے اپنی جان و مال کی امان لے کر اسے قلعہ کے تمام اندرونی حالات سے آگاہ کر دیا، اس کے بعد بہادر شاہ کا دوسرا معتبر امیر مقرب خاں شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، شہنشاہ نے اسے اپنی عنایتوں سے نوازا، اور "وعده علی وصوله بقاء ملکه له" یعنی اس سے وعدہ کیا کہ اگر بہادر شاہ ملنے آئے گا تو اس کی سلطنت اس کے پاس قائم رکھی جائے گی، مقرب خان قلعہ میں واپس گیا، اور بہادر شاہ کو اکبر سے ملنے پر آمادہ کر لیا، بہادر شاہ اکبر کے وعدہ پر بھروسہ کر کے اپنے وزراء اور راجہ رام داس درباری کے ساتھ قلعہ سے اتر کر اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شہنشاہ اکبر نے وعدہ خلافی کر کے اسے اپنی حراست میں لے لیا، جب اہل قلعہ کو یہ خبر ملی تو انھوں نے تقریباً ایک مہینہ تک قلعہ کی مدافعت کی، قلعہ میں بہادر شاہ کا معتبر امیر مقرب خاں کا باپ یاقوت سلطانی بھی تھا، جو نہایت شجاع وغیور تھا، وہ شاہی خاندان کے افراد سے ملا، اور کہا کہ ابھی تک قلعہ محفوظ ہے اور جنگ کی استعداد بھی بدستور ہے، تم میں سے کون عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے آباؤ اجداد کی عزت بچاتا ہے، ؟ لیکن کوئی آمادہ نہیں ہوا، اس پر اس نے کہا "لیتکم نساء فتعذروا" یعنی کاش تم عورتیں ہوتے، تاکہ معذور سمجھے جاتے، اتنے میں اس کا فرزند مقرب خاں شہنشاہ اکبر کا پیغام لے کر اس کے پاس آیا، تو اس نے ملنے سے

انکار کر دیا، اور کہا کہ خدا مجھے تیری صورت نہ دکھائے تو بہادر شاہ کو ساتھ لے کر قلعہ سے اترا اور اُسے حراست میں چھوڑ کر آرہا ہے، مقرب خاں کو باپ کے طعنہ کا اتنا صدمہ ہوا کہ وہ قلعہ سے اتر کر ابو الفضل کی محفل میں گیا اور پیٹ میں خنجر مار کر خودکشی کر لی، ادھر یاقوت سلطانی نے شاہی خاندان کے رویہ سے مایوس ہو کر دشمن کی محکومی کی ذلت پر عزت کی موت کو ترجیح دی، چنانچہ اُس نے اپنی تعمیر کردہ مسجد میں بڑی دیر تک نماز پڑھی، پھر خیرات کی، اسی مسجد کے قریب اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھودی، اپنا کفن تیار کیا، پھر عزیزوں کو وصیت کرنے کے بعد افیون کھا کر خودکشی کر لی، اور اسی قبر میں دفن کیا گیا۔ ظفر الوالہ کے بیان کے مطابق اہلِ قلعہ نے تقریباً ایک مہینہ تک مدافعت کرنے کے بعد جان و مال کی امان لے کر قلعہ حوالہ کر دیا، لیکن قیاس ہے کہ یہ مدافعت صرف اٹھارہ روز تک جاری رہی جس کا ثبوت نامی کے اس کتبہ سے ملتا ہے جو جامع مسجد اسیر گڈھ میں داخل ہوتے وقت درمیانی کمان کے ایک ستون پر نظر آتا ہے، اس کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسیر گڈھ ۶ بہمن ۴۵ء الٰہی میں فتح ہوا، اور شہنشاہ اکبر ۲۴ بہمن کو قلعہ میں داخل ہوا، سمجھ میں نہیں آتا کہ اکبر نے جس قلعہ کو اتنی جانفشانی کے بعد حاصل کیا، اس میں داخل ہونے میں اٹھارہ روز کی تاخیر کیوں کی، غالباً بہادر شاہ ۶ بہمن کو اکبر کی حراست میں آیا، جسے نامی نے فتح اسیر سے تعبیر کیا، لیکن چونکہ اہلِ قلعہ نے ۱۸ روز تک مدافعت کی، اس لئے اکبر کو ۲۴ بہمن کے پہلے قلعہ میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملا، قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے اس کتبہ کی پوری عبارت درج ذیل ہے:

"تاریخ ۶ بہمن ماہ سنہ ۴۵ الٰہی موافق ۲۲ رجب قلعۂ اسیر مفتوح شد و بتاریخ
۲۴ سنہ موافق شعبان حضرت خاقانی ظل سبحانی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ
غازی بقدم شریف آن را زین ساختند۔"

ز بخت جوان فتح آسیر کرد — جہاں بخش شاہ اکبر ملک گیر
چو نامی طلب کرد تاریخ فتح — خرد گفت بگرفته کوہ اسیر

قایلہ کاتبہ محمد معصوم بکری ابن سید صفائی الترمذی، النقیب اتاالی سید شیر بن بابا
حسن ابدال السبزواری اصلاً والقندھاری مرقداً"

جامع مسجد برہان پور کے جنوبی مینار کے کتبہ سے پہلے ہی معلوم ہو چکا کہ شہنشاہ اکبر ۱۲ فروردین ۴۵ سنہ الٰہی میں وارد برہان پور ہوا تھا، اب جامع مسجد اسیر گڈھ کے اس کتبہ سے واضح ہو گیا کہ وہ ۲۴ بہمن ۴۵ سنہ الٰہی میں مکمل قبضہ کے بعد قلعۂ اسیر میں داخل ہوا تھا، فروردین فصلی سنہ کا پہلا مہینہ ہے، اور بہمن گیارہواں مہینہ۔ اس لئے ان دونوں کتبوں کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اسیر گڈھ پر گیارہ مہینے میں قبضہ ہوا، اسی سے ضمناً یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جامع مسجد برہان پور کے مینار پر اکبر کے ورود برہان پور کا جو ہجری سنہ ۱۰۰۹ تحریر ہے، وہ سہو قلم کا نتیجہ ہے، حقیقت یہ ہے، کہ شہنشاہ اکبر ۲۴ رمضان المبارک سنہ ۱۰۰۸ھ میں برہان پور آیا، ۱۸ شعبان المعظم سنہ ۱۰۰۹ھ میں قلعہ پر کلی قبضہ ہوا، اور وہ ۲۶ شوال سنہ ۱۰۰۹ھ میں لاہور روانہ ہو گیا، اس طرح یہ مہم ایک مہینہ کے بجائے تقریباً ایک سال میں انجام پذیر ہوئی،

آئیے اب ایک نظر کتبہ کے ترقیمہ پر بھی ڈال لیجئے، کتبوں میں کاتب کا نام کتبہ کے خاتمہ میں آتا ہے، جس کے بعد کوئی عبارت نہیں آتی، نامی نے بھی دیگر کتبوں میں اس اصول کی پابندی کی ہے، مگر اس کتبۂ مینار کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کاتب کا نام و نسب خلاف دستور کتبہ کے درمیان میں آیا ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ نامی کو کتبہ میں جو نیا مضمون تحریر کرنا تھا، وہ سب مع نام و نسب تحریر ہو چکا ہے، اور مینار پر

دو سطروں کی جگہ باقی رہ گئی، تو اُس نے اس جگہ تازہ قلم کے طور پر اکبر کے لاہور جانے کا مضمون تحریر کر دیا،

فتح اسیر گڈھ کا ایک عبرتناک پہلو یہ ہے کہ بہادر شاہ فاروقی کی حکومت اس شہنشاہ اکبر نے چھینی جس کی حمایت میں بہادر شاہ کے والد عادل شاہ فاروقی، اس کے ۵ ہزار اعلیٰ سرداروں اور بے شمار سپاہیوں نے ۱۰۰۵ھ میں احمد نگر، بیجا پور اور گول کنڈہ کی ساٹھ ہزار فوج سے لڑتے ہوئے ناندیڑ کے میدان جنگ میں اپنی جانیں قربان کر دی تھیں، پھر لطف یہ ہے کہ بہادر شاہ، شہنشاہ اکبر کا بھی عزیز تھا، اور فاتح اسیر گڈھ ابوالفضل کا بھی، چنانچہ شہزادہ مراد کی بیوی بہادر شاہ کی بیٹی تھی، اور بہادر شاہ کی بیوی ابوالفضل کی بہن، سچ ہے انسان حرص دنیا میں مبتلا ہو کر نہ کسی کے احسان کا خیال کرتا ہے، نہ رشتہ کا لحاظ،

شہنشاہ اکبر نے اسیر گڈھ فتح تو کر لیا، لیکن اس شاندار فتح کا نتیجہ اُس کے حق میں عبرت خیز نکلا، کیونکہ فتح اسیر کے تھوڑے ہی عرصہ بعد نہ خاندیس کی سلطنت پر قبضہ کرنے والا شہنشاہ اکبر رہا، نہ فاتح اسیر گڈھ ابوالفضل جو اس مہم میں اکبر کا سپہ سالار تھا، نہ شہزادہ دانیال جسے خاندیس کا صوبہ دار بنایا گیا تھا، یہ تینوں یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو گئے، اور حسرتناک موت مرے، سب سے پہلے ابوالفضل کی باری آئی، فتح اسیر گڈھ کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد شاہزادہ سلیم (جہانگیر) نے دوبارہ بغاوت کی، اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کر کے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، اکبر نے اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے ابوالفضل کو دکن سے طلب کیا، وہ اکبر کی طلب پر احمد نگر سے آگرہ جا رہا تھا، اسے نرسنگھ دیو بندیلہ نے شہزادہ سلیم کے ایماء سے کیم ربیع الاول ۱۰۱۱ھ میں بمقام انتری بے دردی سے

قتل کر دیا،[1]

ابوالفضل کے دردناک قتل کے ٹھیک پونے دو سال بعد شہزادہ دانیال کی حسرتناک موت واقع ہوئی، جسے شہنشاہ اکبر نے فاروقیوں سے چھینی ہوئی سلطنت خاندیس کا مالک و مختار بنایا تھا، اور جس کے نام پر خاندیس کا نام داندیس یعنی دانیال کا دیس رکھ دیا تھا، شہزادہ کی زندگی عیش و عشرت میں گذر رہی تھی، اور اُس کی صحت کثرت مے نوشی سے برباد ہو گئی تھی، اس کے پہلے شہزادہ مراد کی زندگی بھی عین عالم شباب میں اسی شراب خانہ خراب کی نذر ہو چکی تھی، جب شہنشاہ کو اس کی خبر ہوئی، تو اُس نے دانیال کے خسر عبدالرحیم خان خاناں کو جو اس کا اتالیق بھی تھا، فرمان بھیج کر تاکید کر دی کہ اس کی شراب نوشی پر پابندی عائد کر دی جائے، خان خاناں نے محل پر پہرہ بٹھا کر شراب کا داخلہ بند کرا دیا، دانیال شراب کے لئے تڑپنے لگا، تو اس کے نوکر مرشد قلی خاں کو ترس آیا، شہزادہ کی ایک پسندیدہ بندوق تھی، جس کا نام اس نے یکہ و جنازہ رکھا تھا، اور اس پر اپنا یہ شعر کھدوایا تھا،

از شوق شکار تو شود جان تر و تازہ — بہر کہ خورد تیر تو یکہ و جنازہ

مرشد قلی خاں وہی بندوق لے کر محل سے نکلا، اور اس کی نالی میں شراب بھر کر لے آیا، پہرہ داروں کو شبہ نہیں ہوا، شہزادہ ساری شراب غٹ غٹ پی گیا، اور پیتے ہی لوٹ پوٹ ہو کر موت کا شکار ہو گیا، کیونکہ بندوق میں لوہے کا میل اور بارود کا دھواں جما ہوا تھا، جس سے شراب زہر آلود ہو گئی تھی، افسوس اُس نے اپنی جس بندوق کا نام یکہ و جنازہ رکھا تھا، اسی نے اس کا جنازہ نکال دیا، اور اُس نے عین عالم جوانی میں اپنی جان عزیز شراب خانہ خراب پر قربان کر دی، شہنشاہ اکبر جو پہلے ہی اپنی والدہ کی رحلت، شہزادہ مراد اور

[1] دربار اکبری ص ۵۴۵،

اور ابوالفضل کی حسرتناک موت اور شہزادہ سلیم کی پے در پے بغاوت سے شکستہ دل تھا، شہزادہ دانیال کی اس عبرتناک موت کے صدمہ کو برداشت نہ کر سکا، اور اس سانحہ کے چھ ماہ بعد بصد حسرت ویاس دنیا سے رخصت ہو گیا،

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

بزرگانِ دین سے عقیدت رکھنے والوں کا یہ خیال ہے کہ فتح اسیرگڈھ کے بعد اکبر کی پے در پے پریشانیوں کا سبب برہان پور کے اولیاے کرام کی دل آزاری ہے، اکبر نے اسیرگڈھ فتح کیا تو برہان پور کے اکثر مشائخ پر فاروقی بادشاہ کی حمایت کا الزام لگا کر انھیں قید و بند کے مصائب میں مبتلا کر دیا، اس نے مسیح الاولیا حضرت شاہ عیسیٰ جنداللہ کو جو اپنے زمانہ کے غوث تھے، دیگر بزرگانِ دین کے ساتھ جو آگرہ لے جا کر نظر بند کر دیا، انھیں مسیح الاولیا کے مرید و خلیفۂ خاص حضرت عبداللہ سندھی جو اپنے پیر کے حسب الحکم گجرات جا کر خلقِ خدا کی ہدایت میں مصروف تھے، ایک عرصہ کے بعد اپنے پیر کی اجازت سے برہان پور آئے تھے، اکبر نے انھیں بھی شاہ برہان پور کی حمایت کا الزام لگا کر قید کر لیا، اور آگرہ لے جا کر قید خانہ میں بند کر دیا، وہ ایک عرصہ کے بعد حضرت غوث الاولیا، کے فرزند کی سفارش پر رہا ہوئے، مگر برہان پور آنے کی اجازت نہیں ملی، آخر کار وہ ۱۰۱۳ھ میں پنجاب میں راجپوتوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے،

اب سب سے آخر میں ان اشخاص کا مختصر تعارف ضروری ہے، جن کا اس کتبہ میں ذکر آیا ہے، اور وہ شہنشاہ اکبر کے علاوہ بہادر خاں، باباحسن ابدال، سید شیر قلندر، اور محمد معصوم نامی، ہیں،

بہادر خاں (بہادر شاہ فاروقی) :- یہ خاندیس کے سلاطین فاروقیہ کے سلسلہ کا آخری

بادشاہ تھا، جو اپنے والد عادل شاہ فاروقی کی وفات کے بعد ۱۰۰۵ھ میں تخت نشیں ہوا، برہان پور سے ۴ میل دور بہادر پورہ آباد کر کے اسے اپنا دار الخلافہ بنایا، شہنشاہ اکبر نے ۱۰۰۸ھ میں حملہ کر کے اسیرگڈھ کا محاصرہ کیا، اور ۱۰۰۹ھ میں اُس کی سلطنت پر قبضہ کر لیا، اس طرح خاندیس کی فاروقی سلطنت جو ۲۲۵ سال سے قائم تھی ختم ہو گئی،

بہادر شاہ صوم و صلاۃ کا پابند، فیاض اور غربا کا ہمدرد تھا، اور ہر معاملہ میں خدا پر بھروسہ رکھتا تھا، لیکن وہ اپنے والد کی طرح مدبر، دور اندیش، مردم شناس، اور تجربہ کار نہیں تھا،

یہ عجیب اتفاق ہے کہ بہادر شاہ نام کے بادشاہ خاتم سلاطین ثابت ہوئے، چنانچہ برہان پور، احمد نگر، گجرات اور دہلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ہی تھے، شہنشاہ اکبر بہادر شاہ فاروقی اور اس کے دو شہزادوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا، جنھیں شاہی خزانہ سے وظیفہ ملتا تھا، بہادر شاہ نے ۱۰۳۳ھ میں جہانگیر کے عہدِ سلطنت میں بمقام آگرہ انتقال کیا، اور وہیں دفن ہوا،

باباحسن ابدال :- ایک بزرگ کا نام ہے، وہ بستی بھی حسن ابدال کہلاتی ہے، جس میں اُن کا مقبرہ ہے، کتبہ نویس محمد معصوم نامی کی والدہ انھی کی اولاد میں تھیں،

سید شیر قلندر :- یہ باباحسن ابدال کے فرزند اور اپنے زمانہ کے روحانی پیشوا تھے، اُن کا مولد سبزوار اور وطن قندھار تھا، ان کا مقبرہ بھی قندھار میں ہے، جس کے متولی محمد معصوم کے آباء و اجداد تھے،

میر محمد معصوم[۵۵] :- محمد معصوم نام، نامی تخلص، ان کے آباء و اجداد شہر ترمذ کے سادات تھے جنھوں نے

[۵۵] مآثر الامراء جلد سوم صفحہ ۳۲۶ تا ۳۳۰ کی تلخیص،

دو تین پشتوں سے قندھار میں سکونت اختیار کرلی تھی، جہاں وہ سید شیر قلندر کے مقبرہ کی تولیت کے فرائض انجام دیتے تھے، محمد معصوم کے والد سید صفائی نے قندھار سے ہجرت کرکے بھکر (سندھ) کو وطن بنالیا تھا، جہاں محمد معصوم کی ولادت ہوئی محمد معصوم نے مروجہ تعلیم سے فارغ ہوکر تلاش معاش میں گجرات کا سفر کیا، کچھ عرصہ کے بعد شہنشاہ اکبر کے دربار میں رسائی حاصل کرکے مقرب شاہی بن گیا، وہ عہد جہانگیر میں امین الملک بن کر بھکر گیا تھا، جہاں اس کا انتقال ہوگیا،

محمد معصوم نامی کی مختلف حیثیتیں تھیں، وہ نثار بھی تھا، شاعر بھی، مورخ بھی، طبیب بھی، کتبہ نویس بھی، اس کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) دیوان نامی (۲) مثنوی معدن الافکار بجواب مخزن الاسرار (۳) تاریخ سندھ (۴) مفردات معصومی، آخری کتاب طب میں ہے،

اس کو کتبہ نویسی کے فن سے خاص دلچسپی تھی، چنانچہ اس نے ہندوستان سے ایران جاتے ہوئے اثنائے راہ میں تبریز و اصفہان تک کئی عمارتوں اور مسجدوں پر کتبے کندہ کئے ہیں، اس مقالہ میں فتح اسیر سے تعلق رکھنے والے اس کے سات کتبے درج ہوئے ہیں اس سلسلہ کا اس کا آٹھواں کتبہ قلعہ آگرہ کے دروازہ پر ہے:۔

معارف کے پرانے پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ اور ہزاروں محققانہ علمی و ادبی و تنقیدی، تاریخی و دینی مضامین کا قابل قدر مجموعہ ہے، اس کے پرانے پرچے اکثر سنین کے موجود ہیں، ان کی قیمتوں کافی رعایت کردی گئی ہے، دفتر سے خط و کتابت کریں،

"منیجر"

قبرص (سائپرس)

از محمد اقبال ندوی ناظر کتب خانہ دار المصنفین

"ادھر کچھ عرصہ سے اخبارات میں قبرص کا ذکر بہت آرہا ہے، اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے تاریخی حالات بیان کردیئے جائیں، ذیل کی سطور اسی خیال کے ماتحت شائع کی جارہی ہیں"

قبرص، بحر متوسط کے مشرقی حصہ میں ایک جزیرہ ہے، جس کا رقبہ ۹ ہزار ۲ سو پچاسی کیلومیٹر ہے اور آبادی ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۵ لاکھ ۳۰ ہزار ہے، یونانی ۴۳۰۰۰۰ اور ترک ایک لاکھ ہیں، اس کا دار السلطنت نیکوسیا ہے، اور اس کے مشہور شہر لیماسول Limasol اور فماجوستا Famagosta ہیں،

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شام پورے طور پر اسلامی حکومت کے دائرہ میں شامل ہوگیا اور حضرت معاویہؓ اس کے گورنر مقرر ہوئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ رومیوں کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے مسلمانوں کو بحری طاقت حاصل کرنا ضروری ہے، لیکن عراق شام و مصر کے معرکوں میں بہت سے تجربہ کار سپہ سالار اور جانباز سپاہی شہید ہوچکے تھے، اور بری لڑائیوں کا سلسلہ ابھی تک بالکل ختم نہیں ہوا تھا، اس لئے حضرت عمرؓ کی احتیاط پسند اور مآل اندیش طبیعت نے بحری لڑائی کی اجازت نہیں دی، چند برس میں جب اسلامی اقتدار مستحکم ہوگیا تو حضرت عثمانؓ کے دور میں بحری مہم کی

اجازت مل گئی، حضرت معاویہؓ نے جنگی کشتیوں کا ایک بڑا زبردست بیڑہ تیار کیا، سائپرس (قبرص) بحر روم میں کلید کی حیثیت رکھتا تھا، اور شامی سرحد سے قریب تھا، مصر سے بھی آسانی سے مدد پہنچ سکتی تھی، اس لئے حضرت معاویہؓ نے اس طرف اپنے بیڑہ کو حرکت دی، مصر سے عبداللہ بن سعد بھی کمک لیکر آگئے، اور قبرص پہنچکر اس کے ساحلی علاقہ پر حملہ آور ہوئے، لیکن اہل قبرص نے جنگ کے بجائے سالانہ سات ہزار دینار ادا کرنے کے وعدہ پر صلح کرلی، یہی رقم وہ اس سے پہلے رومیوں کو دیتے تھے، اس کے ساتھ انھوں نے یہ اقرار کیا کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی جنگی کارروائی نہیں کریں گے، اور ہمیشہ مسلمانوں کو رومی دشمنوں کی نقل و حرکت سے باخبر کرتے رہیں گے،

لیکن اس معاہدہ کے خلاف انھوں نے ۳۲ھ میں مسلمانوں کے خلاف جنگی کشتیوں اور اسلحہ سے رومیوں کی مدد کی، تو حضرت معاویہؓ نے ۳۳ھ میں دوبارہ قبرص پر چڑھائی کی، لیکن وہاں کے باشندوں نے پھر صلح کرلی، اس مرتبہ وہاں کا نظم و نسق قابو میں رکھنے کے لئے، امیر معاویہؓ نے بارہ ہزار تربیت یافتہ فوج روانہ کی جنھوں نے مسجدیں تعمیر کیں اور شہر آباد کئے، امیر معاویہؓ کی وفات تک وہاں کے باشندے خراج دیتے رہے، لیکن ان کے بعد پھر خراج دینا بند کردیا، اس کے نتیجہ میں تادیبی کارروائی کی جاتی رہی، اور بنی امیہ اور بنی عباس کے طاقتور عہد میں یہ جزیرہ اسلامی حکومت کے دائرہ سے باہر نہیں نکلنے پایا،

جب بارھویں صدی عیسوی میں صلیبی حملوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ۱۱۹۱ء میں انگلستان کا بادشاہ رچرڈ سسلی سے شامی شہر عکا کی جانب روانہ ہوا تو تیز طوفانی ہواؤں نے اسے منزل مقصود کے بجائے جزیرہ قبرص کے ساحل پر پہنچادیا،

قبرصی حکمران اسحٰق کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس جنگی قافلہ کو گرفتار کرنے اور اس کے مال و اسباب پر قبضہ کر لینے کا حکم دیا، رچرڈ خود تو ہاتھ نہیں آیا مگر اسکی لڑکی جوانا، اور اس کے خاوند گرفتار ہوگئے، رچرڈ بہت غضبناک ہوا اور چند دنوں کے بعد اس کے جواب میں قبرص پر فوج کشی کردی، اور معمولی جنگ کے بعد قبرص کے دارالسلطنت پر قابض ہوگیا، اسحاق نے اپنے آپ کو رچرڈ کے حوالہ کردیا، اس کے بعد رچرڈ قبرص کا انتظام ایک فوجی دستہ کے سپرد کرکے عکا کی جانب روانہ ہوگیا اور ایک عرصہ تک محاصرہ کے بعد جون ۱۱۹۴ء میں اسے فتح کرلیا،

رچرڈ کی فتح کے بعد قبرص صلیبیوں کی تحریک کا مرکز بن گیا، جس کا اندازہ عکا کے محاصرہ سے ہوتا ہے، ابن اثیر کے قول کے مطابق وہ انگریزوں کی طاقت کا ایک عظیم مرکز ہوگیا،" پھر ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین نے جب بیت المقدس فتح کرلیا تو یہاں کا فرنچ حکمران لوزنجان قبرص چلا گیا، اس طرح قبرص فرانسیسی مملکت کا ایک حصہ ہوگیا جس کی غمازی فرانسیسی تہذیب آج بھی کررہی ہے، لوزنجان اور وہ فرانسیسی جو یہاں آباد ہوئے تھے عرصہ تک مقیم رہے، عصر حاضر میں بھی شہر نیکوسیا، میشدہ اور اس کے گرد و نواح میں فرانسیسی معماروں کی تعمیر کردہ عمارتوں، محلوں اور کلیساؤں سے فرانسیسی تہذیب و ثقافت کی جھلک نظر آتی ہے،

قبرص ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بحر روم کے دروازے مسیحی حملہ آوروں کے لئے کھل گئے، اور اسلامی ممالک ان کے حملوں کی آماجگاہ بن گئے، چنانچہ ۱۳۶۵ء میں اسکندریہ پر شدید حملہ ہوا، یہ جمعہ کا دن تھا کسی حملہ کا خیال نہ تھا، لوگ نماز ہی میں تھے کہ عیسائی فوجیں اسکندریہ میں اتر گئیں اور بڑی بے دردی سے قتل و غارت گری کی، لیکن اس جنگ

یں مال غنیمت کی کثرت اور مسلمانوں کے شدید نقصان کے باوجود پطرس کو لوٹ مار کے
سوا اور کچھ حاصل نہ ہوا، عباسی تو برائے نام خلیفہ تھے، مصر پر مملوک سلاطین کی حکمرانی
تھی، چنانچہ ان کی طرف سے فوج بھیجی گئی، لیکن مسیحی حملہ آور اور ان کا سردار پطرس
اس سے پہلے بھاگ چکے تھے، بقول نویری "پطرس چور کی طرح اسکندریہ میں داخل ہوا اور
چوری کر کے نکل گیا"، اس کے بعد اگرچہ اس قسم کا کوئی حملہ نہیں ہوا، مگر کھٹ پٹ کا سلسلہ
بند نہیں ہوا اور مصر کے شمالی علاقہ میں برابر مسیحی حملہ کا دھڑکا لگا رہتا تھا،

آخر ۱۴۲۲ء میں جب سلطان برسبائے مملوک سلطنت کا تخت نشین ہوا تو اس نے
گذشتہ اولوالعزم بادشاہوں کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کر لیا اور قبرص کو فتح کر کے از سر نو اپنی حکومت
میں شامل کر لینے کا منصوبہ بنایا وہ ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک حالات نے اس کا موقع پیدا
کر دیا کہ ۱۴۲۳ء میں انگریزوں نے مسلمانوں کی کشتیوں کو ساز و سامان اور سو سے زائد مسافروں
کے ساتھ گرفتار کر لیا، اور قبرص کے حکمراں نے ہدایا دیکر اپنے قبضہ میں کر لیا، تو برہم ہو کر
اپنے ارادہ کو برسبائے نے مزید مستحکم کیا، اور قبرص کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا،

برسبائے نے جزیرہ قبرص پر تین مرتبہ فوج کشی کی، پہلی بار ۱۴۲۴ء میں حملہ کیا،
ان کے جنگی جہازوں کو تباہ اور لیماسول کے بعض علاقوں کو تاراج کرنے کے بعد قیدیوں
کی بڑی تعداد اور کثیر مال غنیمت کے ساتھ مصر واپس آیا،

دوسرا حملہ پہلے کی بہ نسبت وسیع تھا، ۱۴۲۵ء کے موسم گرما میں مصری ساحلوں سے
حملہ آور ہوا، اور بیروت، طرابلس و شام سے گذرتا ہوا قبرص کے شمالی مشرقی ساحل "قراص"
کے بندرگاہ پر جا پہنچا اور وہاں "فماجوستا" کے جانب رخ کیا، سوار اور پیدل فوج کے خشکی پر
قدم رکھتے ہی فماجوستا کے حکمراں نے اطاعت اختیار کر لی، شہر کے قلعہ پر فتح کا پرچم لہرانے کے بعد

بادشاہ کو امان دیدی، مسلمانوں نے چار روز میں قرب وجوار کے علاقہ کو فتح کر کے لماص کا رخ
کیا، [illegible] قبرصیوں کے ساتھ سخت معرکہ ہوا، اس جنگ میں قبرصیوں اور ان کے معاون
انگریزوں کو شدید جانی اور مالی نقصان پہنچا، مسلمان شکست فاش دینے کے بعد لیماسول
پہنچے اور قلعہ کے ایک بڑے حصہ کو مسمار کر کے شہر کے اندر داخل ہو گئے، اور قلعہ پر اپنا شاہی علم نصب
کر دیا، لیکن قبرص پر بنادقہ کے فوج کی چڑھائی کی خبر پاکر مسلمان قدم آگے بڑھانے کے بجائے
قاہرہ لوٹ آئے، اس جنگ میں بہت سے قبرصی قید ہوئے اور بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا
لیکن برسبائے نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، کیونکہ اس کے حملہ کا مقصد محض غارت گری، مال و دولت
اور لوٹ کھسوٹ نہ تھا، بلکہ اس جزیرہ پر پورا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ دشمن اس کو
مصر پر حملہ کا اڈہ نہ بنا سکیں، اس خیال کے مطابق ۱۴۲۶ء میں قبرص پر حملہ کیا، اور لیماسول
کو فتح کر کے دشمنوں کی ایسی سرکوبی کی کہ پھر انہیں سر اٹھانے کی ہمت نہ ہو، اس سے فارغ
ہو کر جزیرہ کے اندرونی علاقہ میں داخل ہوا، لیکن قبرصی حکمراں جانوس بھی خیروکیتا کے
مقام پر پانچ ہزار سواروں اور سات ہزار پیادوں کے ساتھ مقابلہ کے لیے تیار تھا،
دونوں فریقوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی، آخر کار قبرصیوں کو شکست ہوئی، اس لڑائی
نے ان کا زور توڑ دیا، اور ان کی فوجی طاقت کا خاتمہ ہو گیا،

مسلمانوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور جزیرہ کے دار السلطنت کی جانب بڑھے،
اب قبرصیوں میں مقابلہ کی طاقت باقی نہیں رہ گئی تھی، آسانی کے ساتھ نکوسیا فتح ہو گیا،
اور اس کے کوچہ و بازار اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھے، اذان دیکر جمعہ کی نماز پڑھی
گئی، پایہ تخت کے امراء، اہل علم اور پادری انجیل ہاتھ میں لے کر پناہ کے طلب گار ہوئے،
مسلمانوں نے ان کی درخواست قبول کی اور امان عام کا اعلان کر دیا، اس دن سے قبرص

باضابطہ سلطان اشرف برسبائے کی سلطنت میں شامل ہو گیا،

مسلمان قاہرہ واپس ہوئے تو قبرصی سردار جانوس تین ہزار قیدی اور بے شمار مال غنیمت ساتھ تھا، شہر میں ایک عظیم الشان جلوس نکالا گیا، یہ جلوس جب قلعہ جبل پہونچا تو جانوس اتر کر زمین بوس ہوا، پھر جب سلطان کے پاس حاضر ہوا تو قدمبوسی کی، اس کی جان بخشی کی گئی لیکن احتیاط کے طور پر حراست میں قلعہ کے برج میں رکھا گیا، یاد ہوگا کہ ۱۳۶۵ء میں اچانک اسکندریہ پر قبرص کی طرف سے حملہ کیا گیا تھا اور بے شمار مسلمانوں کو بے دریغ تہ تیغ کیا گیا تھا، شاہ اشرف برسبائے کی اس فتح نے لوگوں کے جلے ہوئے دلوں پر مرہم رکھا اور ذلت کا احساس دور کیا، اور ان کے اندر نئے سرے سے اعتماد پیدا ہوا، ازراہ کرم جانوس کو دو ہزار دینار فدیہ لے کر آزاد کر دیا گیا، اس کے بعد سے قبرص سلاطین مصر کی بقار حکومت تک مصر کے زیر اثر رہا، جب ۱۴۵۸ء اور ۱۴۵۹ء میں ارکان سلطنت میں شدید اختلاف شروع ہوگیا تو ۱۴۶۰ء میں بنادقہ پھر اپنا رسوخ قبرص پر وسیع کرنے لگے، یہاں تک کہ وہ جزیرہ کے والی ہو گئے

۱۵۱۷ء میں مصر ترکان آل عثمان کے قبضہ میں آیا اور سلطان سلیم اول کے دور خلافت عثمانیہ کا آغاز ہوا، لیکن قبرص کی فتح دوسرے سلیم کی منتظر تھی،

جب سلطان سلیم ثانی نے یمن کو فتح کرنے اور فتنہ کو فرو کرنے کے بعد اطمینان کی سانس لی تو جزیرہ قبرص کو فتح کرنے کا ارادہ کیا، اگست ۱۵۷۰ء میں سپہ سالار مصطفےٰ ایک لاکھ فوج ساٹھ کشتیوں اور تین سو جنگی جہازوں پر مشتمل عثمانی بیڑہ کے ساتھ ایک قدیم شہر لمانوسنت پہنچا، ترک فوج کی مزید کمک بھی جاری رہی، بنادقہ نے ۱۵۶۷ء میں شہر کی دیواروں کو مضبوط کر دیا تھا، اس کے اردگرد خندق کھود دی تھی، اور اس کی نگرانی اور حفاظت کے لئے فوج کا ایک مضبوط دستہ متعین کر دیا تھا، لیکن مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا دفاع کارگر ثابت نہ ہوا، یہ محاصرہ

عید تک ایک ماہ جاری رہا، لیکن ۹ر ستمبر میں ترک شہر میں داخل ہو گئے، اس جنگ میں تقریباً بیس ہزار افراد قتل ہوئے تقریباً بیس ہزار گرفتار کئے گئے، ایک ہفتہ میں پورا تسلط قائم ہوا،

ترک فماجوستا کے علاوہ تمام شہروں میں قابض ہو گئے اور طبلہ بھی اسی سنہ میں فتح کیا، طویل مدت تک محاصرہ سے پریشانی اور سخت سردی کی وجہ سے ۱۶ر اپریل کو مسلمانوں نے جنگ چھیڑ دی، ینقولا اپنے حامیوں کی سات ہزار تعداد لیکر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا اور مسلمانوں کی پیش قدمی روک دی، ینقولا نے حفاظت کی غرض سے شہر کی دیواروں کو اور مضبوط کیا اور اس کے چاروں طرف گہری خندق کھدوائی، لیکن غذا کی قلت نے شہر کو مسلمانوں کے حوالہ کرنے پر مجبور کیا، انھوں نے یہ شرط رکھی کہ پیادوں اور سواروں کو کاندیا تک ترکی کشتیوں پر جانے کی اجازت دیجائے، لیکن مسلمانوں نے اس شرط کو تسلیم نہیں کیا، اور ان سب کو گرفتار کر لیا، ینقولا سارے ہنگامہ اور کشت وخون کا ذمہ دار تھا، اس کی وجہ سے ہزاروں شہریوں کی جانیں گئیں، اسلئے اس کی جان بخشی نہیں کی گئی اور قتل کی سزا دی گئی،

اس کے بعد قبرص عثمانی حکومت کا ایک جزو رہا، اگرچہ اٹھارہویں صدی کے شروع سے دولت عثمانیہ کی حالت کمزور ہونے لگی تھی، اور یورپ کی حکومتیں اس کی نقصان رسانی میں مصروف تھیں اور آہستہ آہستہ یورپی مقبوضات ترکوں کے ہاتھ سے نکلتے جارہے تھے، جنگی اہمیت کی بنا پر قبرص پر ان کی نظر تھی، وہ بحر روم کی کنجی سمجھا جاتا تھا، لیکن ترکی حکمرانوں نے ۱۸۷۸ء تک اسے ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا، ۱۸۷۶ء میں سلطان عبدالحمید تخت نشین ہوئے، اس وقت دولت عثمانیہ بڑی مصیبت میں مبتلا تھی، یورپی حکومتیں ترکی کی عیسائی رعایا کو بھڑکا کر جابجا بغاوت کرا رہی تھیں، اور چاہتی تھیں کہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں،

سلطان عبدالحمید نے قسطنطنیہ میں دول یورپ کے نمائندوں کی کانفرنس

بلائی تاکہ ان کے مشورہ سے شکایت کا تدارک کیا جائے، لیکن ان لوگوں نے ایسی سخت شرطیں پیش کیں، کہ کوئی باعزت حکومت انھیں قبول نہیں کر سکتی تھی، پھر کیا تھا روس نے لشکر کشی شروع کر دی، بالآخر پھر صلح کی گفتگو شروع ہوئی اور ...... وسیع علاقہ سے ترکوں کو دست بردار ہونا پڑا،

اس صلح نامہ کے بعد انگریزوں نے محسوس کیا کہ اس طرح روس کا اثر بڑھ جائیگا، اور ممکن ہے آگے چل کر ان کے مقبوضات خطرہ میں پڑ جائیں، انگریزی سفیر نے اطمینان دلایا کہ روس کو اب پیش قدمی کا موقع نہ ملنے دیا جائیگا، بشرطیکہ قبرص انگریزوں کو اس لئے دیدیا جائے کہ وہاں ان کی فوجیں رہیں، اور روس کی پیش قدمی کو بروقت روک سکیں، اس ترکیب سے قبرص انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا، اس شاطرانہ چال کی کامیابی پر اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم نے ملکہ وکٹوریہ کو مبارکباد دی کہ بحر روم کی کنجی ہمارے ہاتھ میں آگئی ہے،

گو قبرص عملاً انگریزی علاقہ بن گیا تھا، مگر رسمی طور پر ترکی سیادت کا نام باقی تھا، پہلی جنگ عظیم میں جب ترکی حکومت نے جرمنی کا ساتھ دیا تو انگریزوں نے نام کی اس سیادت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا، اور ۱۹۱۴ء سے باضابطہ قبرص کو برطانوی شہنشاہیت میں شامل کر لیا، جنگ کے بعد ۱۹۲۴ء میں لوزان کی صلح کانفرنس نے بھی اس کی تصدیق کر دی،

عرصہ تک یہ اس طرح برطانوی حکومت کے ماتحت رہا، لیکن رفتہ رفتہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح یہاں کے باشندوں کو بھی آزادی کی خواہش ہوئی، برطانیہ کی طرف سے کچھ عرصہ تک ٹال مٹول ہوتی رہی پھر جب اس سے کام نہیں چلا تو کچھ معمولی اختیارات دیئے گئے، لیکن وہاں کے باشندوں کا جذبۂ آزادی اس سے ختم نہیں ہوا، مجبور ہو کر مزید اختیارات دیئے گئے، قبرص کی آزادی کی راہ میں سب سے بڑی دشواری وہاں کے باشندوں

کا باہمی اختلاف تھا، جزیرہ کی آبادی میں عیسائیوں کی اچھی خاصی تعداد ہے اور ترک اقلیت میں ہیں، لیکن ان کی آبادی کا ایک مستقل علاقہ ہے، یونان قبرصی عیسائیوں کا طرفدار تھا اور ترکی حکومت ترکوں کی حامی تھی، بالآخر فروری ۱۹۵۹ء کو جنیوا میں یونان اور ترکی کے درمیان معاہدہ ہوگیا اور طے پایا کہ دو سال کی مدت میں بحر روم کے مشرق میں برطانیہ کے جنگی مصالح اور جزیرہ میں ترکی اقلیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس معاہدہ کو نافذ کر دیا جائے، پھر ۱۴ر دسمبر ۱۹۵۹ء میں انتخابات ہوئے، جن کے بعد مکاریوس قبرص کے صدر اور ڈاکٹر کوتشوک نائب صدر ہوئے،

لیکن اندرونی اختلافات رہ رہ کر ابھرتے رہے، اور وقتاً فوقتاً جھگڑے ہوتے رہے آخر جولائی ۱۹۷۴ء میں صدر مکاریوس کی حکومت کا فوجی سرداروں نے تختہ الٹ دیا، مکاریوس بھاگ کر دوسرے ملک میں پناہ لی، چونکہ یہ نئی حکومت یونانیوں کے زیر اثر تھی، اس وجہ سے ترکوں کو اپنے بارہ میں خطرہ محسوس ہوا، ترکی حکومت نے ان ترک باشندوں کی حفاظت کی خاطر اپنی فوج قبرص میں اتار دی، اس پر ادھر اودھر سے بہت لے دے ہوئی، مگر ترکی حکومت نے اس واویلا پر کان نہیں دھرا اور صاف کہدیا کہ وہ ترکوں کو لاوارث نہیں چھوڑ سکتی، اور جب تک کوئی قابل اطمینان انتظام نہ ہو جائیگا، ان کی فوجیں اس علاقہ سے نہیں ہٹیں گی، اس صورت حال نے یونانی فوجیوں کو ڈھیلا کر دیا اور مکاریوس کی واپسی کی راہ صاف ہو گئی، چنانچہ چند ماہ ہوئے وہ قبرص میں آگئے، مگر ان کا اثر عیسائی علاقہ تک محدود ہے، ترک فوج ترکی حصہ میں ڈٹی ہوئی ہے، اور آئندہ نظام کے بارے میں بات چیت جاری ہے،

ادبیات

یادِ اقبالؒ

بمناسبت یوم یادبود اقبال

از پروفیسر سید حسن عسکری پٹنہ

شاعرِ مشرق زمیں رنگیں نوا	آنکہ از او یافتہ دانش ضیا
شعرِ او اقوامِ مشرق را حیات	شرحِ راز ہست و بود کائنات
کرد روشن فکرِ او دنیائے دل	تاب و تب انداختہ در آب و گل
پاک دل، دانا سرشت آزاد مرد	آنکہ جز تبلیغِ حق کارے نکرد
ہر چہ گفت از معنیٔ قرآں بگفت	گوہرِ مضمون آں آساں بسفت
بود شیدائے امام المرسلینؐ	عشقِ احمدؐ در دلش بودہ مکیں
زندگی را شعرِ او سنگِ فساں	تیغ براں بہر تسخیرِ جہاں
شمع ساں بر بیتیٔ آدم گداخت	قلبِ او دلسوزی پروانہ داشت
تابِ گفتارش ورا از شکوہ داشت	از خدائے خود جوابِ شکوہ یافت
بد کلامش قوم را بانگِ درا	رہنمونی کرد در ہر مرحلہ
سرِ نہانِ خودی را باز کرد	بار موز بیخودی دمساز کرد

از زبورِ او عجم بیدار گشت	ارمغاں از حجاز آورد و رفت
کس نیاید بعد او دانائے راز	نی ز ترکستان نہ از مصر و حجاز

درسِ صلح و آشتی اقبال داد
صد درودش بر روانِ پاک باد

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

شوق اگر کامیاب ہو جائے	زندگی لاجواب ہو جائے
جس پہ تیرا عتاب ہو جائے	اس کی دنیا خراب ہو جائے
درسِ تعمیر ہے زمانے کو	عشق میں جو خراب ہو جائے
ہے یہی انتہائے ناکامی	آدمی کامیاب ہو جائے
پوچھنا کیا ہے پھر مسرت کا	غم اگر بے حساب ہو جائے
آنکھ مل جائے کاش ساقی سے	یوں بھی دورِ شراب ہو جائے
آپ کے نازِ برہمی کی خیر	کوئی خانہ خراب ہو جائے
ہائے وہ دل جو ایک آہ کے بعد	موردِ صد عتاب ہو جائے
عشق ہی وہ مقام ہے کہ جہاں	معصیت بھی ثواب ہو جائے
پرتوِ حسن کی کرامت ہے	ذرہ بھی آفتاب ہو جائے
چشمِ ساقی کی مستیاں توبہ	پانی پانی شراب ہو جائے

ایک ایسا بھی نام ہے جوہرؔ
ختم جس پر کتاب ہو جائے

مطبوعات جدیدہ

اردو املا، مرتبہ جناب رشید حسن خاں صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۷۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۷ روپے، پتہ: نیشنل اکادمی ۲۳ انصاری مارکیٹ دریا گنج، دہلی۔

مرکزی حکومت کے قائم کردہ ترقی اردو بورڈ کی طرف سے اردو املا کے مسائل پر غور و خوض کے لیے جو سہ نفری کمیٹی تشکیل ہوئی تھی، اس کے ایک ممتاز رکن جناب رشید حسن خاں بھی تھے، جن کو علمی و تحقیقی کاموں کا اچھا تجربہ اور املا و لسانیات کا عمدہ ذوق ہے، انھوں نے اس مبسوط کتاب میں اردو املا کے انتشار اور غلط نگاری کو دور کرنے اور اس میں صحت و یکسانیت پیدا کرنے کے لیے اصول و ضابطے تجویز کیے ہیں، اس سلسلہ میں بڑی کد و کاوش سے ان تمام الفاظ کا مفصل جائزہ دیا گیا ہے جو مختلف املا میں مروج ہیں، پھر ان کے لیے قاعدے بتا کر کسی ایک املا کو دلائل کے ساتھ صحیح قرار دیا گیا ہے، فاضل مرتب نے جدت طرازی سے کام لینے کے بجائے عموماً اپنے پیشرو محققین کی سفارشوں، تجویزوں اور اردو لغت اور نحو و صرف کی مستند کتابوں میں درج کی ہوئی معلومات کی روشنی میں اصول اور قاعدے متعین کیے ہیں، پہلے الف (بشمول الف ممدودہ و مقصورہ، الف و ہائے مختفی اور الف تنوین) سے بنے مختلف الفاظ

کے املا کی تصحیح کی گئی ہے، پھر ت، ۃ، ت/ط، ذ، ز، ژ، ث، س، ص، ض، ک، گ، ن، و، ہ، ہمزہ اور ی سے بنے ہوئے ان تمام لفظوں کا ذکر ہے، جن کے املا میں یکسانیت نہیں ہے، حروف کے بعد گنتیوں کے املا، نقطے، شوشے، نسخ اعراب، علامات اور رموز و اوقاف کے بارہ میں اصول بتائے گئے ہیں، اور ان لفظوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن کو ملا کر لکھا جاتا ہے حالانکہ ان کو منفصل لکھنا چاہیے، جیسے آجکل کے بجائے آج کل وغیرہ، فارسی املا کے ضروری مسائل اور عام قاعدے بھی دو فصلوں میں تحریر کیے گئے ہیں، آخر میں لغت کی تدوین اور متن کی ترتیب کے لیے املا کے اصول اور قاعدے بیان کیے گئے ہیں، شروع میں فاضل مصنف کے قلم سے ایک پر مغز مقدمہ ہے، جس میں املا کی صحت و یکسانیت کی اہمیت اس کے قاعدے منضبط کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، پھر اس کی تعریف اور اس میں اختلاف پائے جانے کی وجہیں بتائی گئی ہیں، املا اور رسم الخط کے دقیق فرق کی وضاحت کی گئی ہے اور ان کوششوں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جو املا کے متعلق پہلے کی جا چکی ہیں، لائق مرتب نے اردو رسم الخط کی اصلاح و تبدیلی اور ہم آواز حرفوں میں سے کسی ایک کو باقی اور بقیہ کو اردو کے حروف تہجی سے خارج کیے جانے کی سخت مخالفت کی ہے اور اس تجویز کو سراسر مہمل بتایا ہے، کہ جو حروف پڑھنے میں نہ آئیں ان کو لکھا بھی نہ جائے، جیسے خوش کو خش وغیرہ، ممکن ہے ان کی بعض سفارشوں اور تجویزوں سے کسی کو مکمل اتفاق نہ ہو تاہم یہ کتاب بڑی محنت و تحقیق سے لکھی گئی ہے، اردو خواں طبقے کو املا کی بے اعتدالی دور کرنے کے لیے ترقی اردو بورڈ کی ان کوششوں کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل، از جناب شورش کاشمیری صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۰۴ مع پلاسٹک کور، قیمت ۱۵ روپے،

سینہ میں گوہی راہی، سید سلیمان ندوی مولانا آزاد کے عیبوں کی تلاش میں سرگرداں رہے مولانا عبد الماجد دریابادی نے مولانا آزاد کے کفن نوچنے میں حیا نہ کی، علامہ انور شاہ اور مولانا حسین احمد مدنی کی قبروں پر امتیاز دیکھا، اول الذکر کا مزار ٹوٹ پھوٹ کر بیٹھ گیا"

(ص ۱۴۴) اس قسم کی تحریر ادب شناس ادیب کے لئے موزوں نہیں، ایک جگہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے پہنچے توڑے جانے اور شاہ عبد العزیزؒ کے بدن پر چھپکلی کا تیل لے جانے کی بے سر و پا روایت بھی نقل ہو گئی ہے، ازدحام کا املا کئی جگہ اژدہام لکھا گیا، ہو جو صحیح نہیں ہے،

ان باتوں سے قطع نظر اس کتاب میں بعض ایسے مفید اور دلچسپ سیاسی واقعات قلم بند ہوئے ہیں، جن کے مطالعہ سے عام ناظرین کو دلچسپی ہوگی، کتاب کے نام رکھنے میں مصنف نے اپنی خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے،

تذکرہ حضرت رفاعیؒ، مرتبہ جناب مولوی شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی ندوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت، طباعت اچھی، صفحات ۱۸۲ مجلد، قیمت صہ رپتہ ا-

تیفیع اسٹور آر، آر مارکٹ، جی، پی اسٹریٹ، بنگلور ۲،

حضرت شیخ سید احمد کبیر رفاعی، مشہور عارف باللہ اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے ہمعصر تھے، عرب ملکوں میں ان کے سلسلہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہی، ہندوستان میں جنوبی ہند اور گجرات وغیرہ میں بھی اس کو زیادہ فروغ ہوا، مصنف کا خاندان بھی رفاعی سلسلہ سے وابستہ ہے، اس لئے انھوں نے بڑی عقیدت سے حضرت شیخ کے فضائل و مناقب تحریر کئے ہیں، ان کا اصل مقصد شیخ کے اتباع سنت، ذوق عبادت، جذبہ خدمت اور حسن اخلاق وغیرہ کو بیان کرنا ہے، خوارق و کرامات کا ذکر ضمناً کیا گیا ہے، یہ مصنف کی پہلی کتاب ہے اس لئے

پتہ: مطبوعات چٹان لمیٹڈ، ۸۰ میکلوڈ روڈ، لاہور (مغربی پاکستان)

یہ جناب شورش کاشمیری کی خود نوشت سوانح عمری ہے، وہ ممتاز ادیب و شاعر اور نامور خطیب و صحافی ہی نہیں ہیں، بلکہ شروع سے انقلاب پسند رہے ہیں، سیاسی ہنگاموں اور قید و بند کی صعوبتوں میں ان کی زندگی گذری ہی، اس لئے اس کتاب میں گذشتہ قومی و سیاسی حالات و کوائف، مذہبی و ملی سرگرمیوں اور مسلم لیگ اور کانگریس کی کشمکش کی داستان بھی آگئی ہے، شروع میں مصنف نے اپنے خاندان، ماحول، بچپن کے بعض واقعات ابتدائی و ثانوی اسکولوں میں تعلیم اور شادی کا ذکر کیا ہے، وہ مجلس احرار کے رکن رکین تھے، اس لئے اس کے خصوصیات اور خط و خال بھی بیان کئے ہیں، اور اس کے روح رواں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا بھی بہت کچھ ذکر آگیا ہے، ان کی سیاسی و ملی سرگرمیوں کا اصل مرکز پنجاب تھا، اس لئے یہاں کے اکثر مشاہیر سیاست بھی زیر بحث آگئے ہیں، تقسیم کے بعد نواکھالی، بہار، دہلی اور پنجاب میں جو بھیانک فسادات ہوئے اس کی پُردرد داستان سے مصنف کی دلسوزی، دردمندی اور انسانیت دوستی کی تصویر سامنے آگئی ہے، شورش صاحب جمعیۃ علمائے ہند اور کانگریس سے زیادہ قریب تھے، اس لئے انھوں نے ان جماعتوں کے اکابر کا عقیدت و احترام سے ذکر کیا ہے، تاثرات میں مصنف کے سیاسی مسلک اور نظریے کی جھلک آگئی ہے، جس سے کہیں کہیں ان کی غیر جانبداری باقی نہیں رہتی ہے، گفتنی کے ساتھ ناگفتنی اور رمز و کنایہ کی باتیں تصریح و وضاحت کے ساتھ لکھی گئی ہیں وہ مولانا ابو الکلام آزاد کے بڑے مداح ہیں، اس مداحی اور عقیدت مندی کے سلسلہ میں اور دوسرے اکابر کے ذکر میں ان کے قلم میں احتیاط باقی نہیں رہی، مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں، ہم دین میں معاصرت کی تیغ بداں بڑے بڑے عابدوں اور فقیہوں کے

اس کی ترتیب و تبویب، انداز بیان اور طرز نگارش وغیرہ میں جو کور کسر رہ گئی ہے، امید کہ آیندہ دور ہو جائے گی،

فکر جمیل اور تاریخ مدرسہ بدر الاسلام، مرتبہ مولوی عثمان احمد قاسمی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت، طباعت اچھی، صفحات ۱۰۴، مجلد ۴۸، قیمت ۳ے وغیرہ، پتے :- (۱) مدرسہ بدر الاسلام، شاہ گنج، ضلع جون پور، (۲) علمی کتاب گھر شاہ گنج، جون پور،

اول الذکر کتاب شاہ گنج ضلع جونپور کے مدرسہ بدر الاسلام کے روح رواں مولانا جمیل احمد مرحوم کی مذہبی و ملی نظموں، غزلوں، مرثیوں اور قطعات تاریخ کا مجموعہ ہے اس کے شروع میں استاذ محترم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی مختصر تقریظ اور مرتب کا عقیدت مندانہ مقدمہ ہے، اسی عقیدت میں ہر دور اور سب ہی طرح کا کلام شائع کر دیا گیا ہے، ادبی و فنی حیثیت سے قطع نظر حضرت شاہ صاحب کے بقول "دینی روح اور افکار و تصورات کی صحت و صداقت اور مولانا کے سادہ اور بے تکلف انداز بیان کی وجہ سے یہ مجموعہ قابل قدر ہے"، دوسرے کتابچہ میں مولانا جمیل احمد اور ان کے بزرگوں کے قائم کردہ مدرسہ بدر الاسلام شاہ گنج کا مختصر تعارف اور اس کے متعلق قوم و ملت کے اکابر کے تاثرات شامل ہیں، اس سے مدرسہ کی گذشتہ کارگذاری کے علاوہ اس کے کارکنوں، خصوصاً مولانا جمیل احمد مرحوم کے اخلاص اور خاموش خدمت کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے،

"ض"

جلد ۱۱۵ ماہ مئی ۱۹۷۵ء مطابق ماہ جمادی الاول سنہ ۱۳۹۵ھ عدد ۵

مضامین